اسلام کا سیاسی نظام

(عہدِ فاروقی میں)

طلوعِ اسلام بابت اکتوبر ۱۹۹۰ء میں ایک مبسوط مقالہ شائع ہوا تھا جس کا عنوان تھا۔ فاروقیت کیا ہے؟ یہ اتنا پسند کیا گیا کہ ہم سے مطالبہ کیا گیا کہ اس مقالہ میں تو اشارات پر اکتفا کیا گیا ہے۔ ضروری ہے کہ جو اسلامی نظام عہدِ فاروقیؓ میں رائج تھا اس کے کچھ تفصیلی گوشے سامنے لائے جائیں۔ ان میں سرِ فہرست "سیاسی نظام" تھا۔ ان تقاضوں کی تعمیل میں، پرویز صاحب کی مایہ ناز تصنیف "شاہکارِ رسالت" سے سیاسی نظام کا عنوان پیش خدمت کیا جاتا ہے۔ اس ضمن میں دو امور کی وضاحت تمہیداً ضروری معلوم ہوتی ہے۔

(۱) پرویز صاحب بھی صدرِ اوّل کے متعلق جو کچھ لکھتے ہیں اس کا مدار بہرحال ہماری تاریخ پر ہی ہوتا ہے۔ اس کے سوا کوئی چارہ ہی نہیں۔ اور ہماری تاریخ جس رطب و یابس کا مجموعہ ہے اس کے متعلق کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ پرویز صاحب کا مسلک یہ ہے کہ اس تاریخ میں جو واقعات ایسے ہیں جو قرآن مجید کے خلاف نہیں، انہیں صحیح تسلیم کیا جا سکتا ہے کیونکہ حضور نبی اکرمؐ اور صحابہ کبارؓ کی زندگی قرآن کے مطابق تھی۔ اس لئے اس دور کی تاریخ کے متعلق جو کچھ پرویز صاحب لکھتے ہیں وہ وہی ہوتا ہے جو ان کی بصیرت کے مطابق قرآن کے مطابق ہے۔ بایں ہمہ، اگر ان کی کسی تحریر میں کوئی بات قرآن کے خلاف نظر آئے تو اسے ان کا سہوِ بصیرت سمجھنا چاہئے۔ اس کی اصلاح کے لئے وہ ہر وقت آمادہ ہوتے ہیں۔

(۲) قرآن کریم کا انداز یہ ہے کہ وہ بیشتر اصول و اقدار عطا کرتا ہے۔ ان پر عمل درآمد کے طریق اُمت کی صوابدید پر چھوڑ دیتا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان اصولوں کو بروئے کار لانے کے طریق خود وضع کرے۔ قرآنی اصول و اقدار و قوانین تو ہمیشہ غیر متبدل رہتے ہیں لیکن انہیں نافذ العمل کرنے کے لئے طریق کار۔ یا یوں کہئے کہ جزئی قوانین، اسلامی مملکت وضع کرتی ہے، وہ حالات کی تبدیلی کے ساتھ بدلے جا سکتے ہیں۔ یہی صورت صدرِ اوّل کی اسلامی مملکت کی تھی۔ لہٰذا عہدِ فاروقیؓ کے سیاسی نظام میں جو جزئی قوانین دکھائی دیں، ضروری نہیں کہ وہ من و عن آج بھی نافذ کئے جائیں۔ آج کی اسلامی مملکت انہیں اپنے سامنے رکھے گی۔ ان میں سے جو قوانین ایسے ہوں گے جو آج بھی نافذ العمل ہو سکتے ہیں، انہیں اسی طرح نافذ کرے گی۔ دیگر قوانین میں تبدیلی کر دے گی۔ اور حسبِ ضرورت نئے قوانین کا اضافہ بھی کر سکے گی۔ بنا بریں، جب آپ عہدِ فاروقیؓ کے سیاسی نظام کو سامنے لائیں تو اس سے یہ نہ سمجھیں کہ اسی قسم کا نظام ہو بہو نافذ کیا جائے تو اسے اسلامی نظام کہا جائے گا۔ صورت یوں نہیں ہوگی۔ اس

تاریخی مطالعہ سے یہ حقیقت ہمارے سامنے آئے گی کہ اس زمانے میں قرآن کے ابدی اصولوں کی روشنی میں اس طرح نظام قائم کیا گیا تھا۔ اس مطالعہ سے ابھی یہ راہ نمائی حاصل ہوگی کہ کسی زمانے کی اسلامی مملکت کے طرق و اسالیب ابدی اور غیر متبدل نہیں ہو سکتے۔

اس تمہیدی وضاحت کے بعد "شاہکار رسالت" سے سیاسی نظام کا عنوان ملاحظہ فرمایئے۔

سیاسی نظام عہدِ فاروقی میں

قرآن کے سیاسی نظام (یا بالفاظِ دیگر ہیئتِ اجتماعیہ انسانیہ) کا اصل الاصول "عروۃ الوثقیٰ" یا اساسِ محکم، سورۂ آلِ عمران کی وہ آیۂ جلیلہ ہے جس میں کہا گیا ہے کہ

> کسی انسان کو اس کا حق حاصل نہیں — خواہ خدا نے اسے ضابطۂ قوانین کا حامل یا منصبِ حکومت پر سرفراز یا مقامِ نبوت پر فائز بھی کیوں نہ کر دیا ہو، کہ وہ لوگوں سے کہے کہ تم اللہ کے نہیں بلکہ میرے محکوم بن جاؤ۔ اسے یہی کہنا چاہئے کہ تم اس کتابِ خداوندی کی رُو سے جسے تم پڑھتے پڑھاتے ہو اور جس کے حقائق و غوامض پر غور و فکر کرنے سے اس کے معانی و مقاصد کی حقیقت تک پہنچتے ہو، ربانی بن جاؤ۔ (۳/۷۹)

یہ انسانی آزادی کا وہ عظیم انقلابی منشور ہے جس کی نظیر آپ کو کہیں نہیں ملے گی۔ انسانی فکر نے کبھی غلامی

انسانی آزادی کا منشور

اور محکومی کے استبداد سے تنگ آ کر اس سے نجات حاصل کرنے کی تدابیر سوچیں۔ پہلے اس نے شخصی حکومت (ملوکیت) کی لعنت سے چھٹکارا حاصل کرنے کے لئے ہاتھ پاؤں مارے۔ پھر مذہبی پیشوائیت (تھیاکریسی) کی دسیسہ کاریوں کے دامِ ہمرنگِ زمین کو توڑا۔ اس کے بعد اس نے جمہوری نظام اختیار کیا۔ انسانی فکر ابھی تک اسی مقام تک پہنچ سکی ہے۔ لیکن وہ اس سے بھی مطمئن نہیں۔ اس لئے کہ انسانوں کی محکومی سے نجات، جمہوری نظام میں بھی نہیں مل سکتی۔ اس میں صرف اتنا ہوتا ہے کہ ایک شخص (ملوکیت) کی محکومی کے بجائے انسانوں کے ایک گروہ (اکثریت) کی محکومی اختیار کرنی پڑتی ہے۔ یہ گروہ، دوسرے انسانوں سے اپنی اطاعت "ذاتی حکم" کی رُو سے نہیں کراتا، اپنے وضع کردہ قوانین کی رُو سے کراتا ہے لیکن محکومی کسی کے ذاتی فیصلہ کی ہو، یا اس کے فیصلہ کو قانون کا نام دے دینے کی، بات ایک ہی ہے۔ اس سے انسان، دوسرے انسانوں کی محکومی کی زنجیروں سے رستگاری حاصل نہیں کر سکتا۔ اس لعنت سے نجات حاصل کرنے کا طریقہ ایک ہی ہے اور وہ، وہ طریق ہے جسے مندرجہ بالا قرآنی منشورِ آزادی کے آخری حصہ میں بیان کیا گیا ہے۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ قانون سازی کا حق کسی انسان (یا انسانوں کے گروہ) کو حاصل نہیں۔ یہ حق صرف خدا کو حاصل ہے۔ اسی کو خدا کا "حقِ حکومت" کہا گیا ہے۔ سورۂ یوسف میں ہے:-

إِنِ الْحُكْمُ إِلَّا لِلّٰهِ ۖ أَمَرَ أَلَّا تَعْبُدُوٓا إِلَّآ إِيَّاهُ ۚ ذٰلِكَ الدِّينُ
الْقَيِّمُ وَلٰكِنَّ أَكْثَرَ النَّاسِ لَا يَعْلَمُونَ ۔ (۱۲/۴۰)

یاد رکھو۔ حقِ حکومت خدا کے سوا کسی کو حاصل نہیں۔ اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کی جائے۔ یہی محکم نظامِ حیات ہے لیکن اکثر لوگ اس حقیقت کو سمجھتے نہیں۔

خدا کا یہ حقِ حکومت اس طرح خالصتاً اسی کے لئے مختص ہے کہ وہ اس میں کسی اور کو شریک نہیں کرتا

لَا يُشْرِكُ فِي حُكْمِهِ أَحَدًا (۱۸/۲۶)

وہ اپنے دائرہ حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا

کتاب اللہ کی حکومت

لیکن خدا تو ہمارے سامنے (محسوس شکل میں) نہیں آتا۔ اس سے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اس کی اطاعت (محکومیت) کس طرح اختیار کی جائے۔ اس کا جواب اس نے خود ہی یہ کہہ کر دے دیا کہ اس کی اطاعت، اس کے عطا کردہ ضابطۂ قوانین (کتاب اللہ) کی رُو سے کی جائے۔ سورۃ الانعام میں ہے۔

أَفَغَيْرَ اللّٰهِ أَبْتَغِي حَكَمًا وَّهُوَ الَّذِي أَنْزَلَ إِلَيْكُمُ الْكِتٰبَ
مُفَصَّلًا ۔۔۔ (۶/۱۱۵)

(اے رسولؐ! ان سے کہو) کہ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ میں خدا کے سوا کسی اور کو اپنا حاکم قرار دے لوں، حالانکہ اس نے تمہاری طرف وہ کتاب نازل کر دی ہے جو ہر بات کو نکھار کر بیان کرتی ہے۔

یہی کفر اور ایمان میں خطِ امتیاز ہے۔

وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ أَنْزَلَ اللّٰهُ فَأُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُونَ ○ (۵/۴۴)

جو اس کے مطابق فیصلے (حکومت) نہیں کرتا جسے خدا نے نازل کیا ہے، یہی لوگ ہیں جنہیں کافر کہا جائے گا۔

لیکن کتاب تو ساکت و صامت حروف، نقوش کا مجموعہ ہوتی ہے۔ اس کی اطاعت کس طرح کی جائے؟

دین اور مذہب میں فرق

یہاں سے مذہب اور دین کا بنیادی فرق ہمارے سامنے آتا ہے۔ بعض لوگوں نے یہ خیال کیا (اور دنیا کے تمام اہلِ مذاہب اسی خیال کے حامل ہیں) کہ یہ اطاعت انفرادی طور پر کی جائے گی یعنی ہر فرد اپنے اپنے طور پر جس طرح جی چاہے احکامِ خداوندی کی اطاعت کرتا رہے۔ اسے مذہب کہتے ہیں جس میں "خدا کی اطاعت" سے مراد اس کی پرستش ہوتی ہے۔ محکومیت نہیں ہوتی۔ لیکن قرآن، انفرادی نہیں بلکہ اجتماعی نظامِ حیات کی تاکید کرتا ہے۔ اسے دین کہا جاتا ہے[۱]۔ وہ کہتا ہے کہ وَاعْتَصِمُوا بِحَبْلِ اللّٰهِ جَمِيعًا۔ (۳/۱۰۲) "تم اس ضابطۂ خداوندی کو اجتماعی طور پر تھامے رکھو"۔ ظاہر ہے کہ اس کے لئے نظامِ حکومت کی ضرورت ہوگی۔ اس سلسلہ میں قرآن کریم نے واضح الفاظ

۱۔ مذہب اور دین کے اس فرق کے لئے میرے مجموعۂ مضامین — بہارِ نو میں "قیامتِ موجود" کا عنوان دیکھئے۔ یا میری انگریزی زبان کی کتاب 'ISLAM; A CHALLENGE TO RELIGION'

میں کہہ دیا کہ تمہارے ایمان و اعمالِ صالحہ کا لازمی نتیجہ استخلاف فی الارض ہوگا۔ (یعنی تمہاری اپنی حکومت) اسی سے تمہارے دین (اجتماعی نظامِ زندگی) کو تمکن حاصل ہوگا اور اسی سے تم اس قابل ہوسکو گے کہ خالصۃً خدا کی محکومیت اختیار کرسکو (۲۴/۵۵)۔ اس نظام (کی مرکزی اتھارٹی) کی اطاعت، خدا کی اطاعت کہلائے گی۔ ان امور کی تفصیل تیسرے اور ساتویں باب میں گزر چکی ہے۔ لیکن اس مقام پر اس کا دہرانا اس لئے ضروری سمجھا گیا ہے کہ اس کے بغیر عہدِ فاروقی کا سیاسی نظام (جو اس کتاب کا عمودی موضوع ہے) اچھی طرح سمجھ میں نہیں آسکے گا۔ (اس تکرار کے لئے میں قارئین کے حسنِ ذوق سے معذرت خواہ ہوں)

اسلام اپنی آزاد مملکت چاہتا ہے

اس حقیقت کو اچھی طرح ذہن نشین کر لیجئے کہ اسلام ایک زندہ نظام (یعنی دین) کی حیثیت صرف اپنی ایک آزاد مملکت میں اختیار کرسکتا ہے۔ غیروں کی حکومت میں، یا خود مسلمانوں کی ایسی حکومت میں جس کی بنیاد کتابِ خداوندی پر نہ ہو، اسلام ایک رسمی مذہب بن کر رہ جاتا ہے، دین کی شکل اختیار نہیں کرسکتا۔ اس قسم کی حکومتوں کے تابع، مسلمان، اسلام کے مطابق زندگی بسر کر ہی نہیں سکتے۔ تقسیمِ ہند سے پہلے، تحریکِ پاکستان کے دوران، ہندوستان کے علماء کی ایک جماعت کا موقف یہ تھا کہ آزاد ہندوستان میں بے شک حکومت اکثریت (یعنی ہندوؤں) کی ہوگی لیکن وہ جب ہمیں "مذہبی آزادی" کی ضمانت دیتے ہیں تو پھر مسلمانوں کے لئے الگ مملکت کا مطالبہ کیا معنی رکھتا ہے؟ اس کے جواب میں علامہ اقبال نے کہا تھا کہ ؎

ملّا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

اسلام کو آزادی، صرف اپنی آزاد مملکت میں میسر آسکتی ہے۔ جب تک مسلمانوں کی اپنی آزاد حکومت نہ ہو، قرآن کے احکام، قانونی شکل میں نافذ ہی نہیں کئے جاسکتے۔ اور (ظاہر ہے کہ) جو احکام، قانونی شکل میں نافذ نہ کئے جاسکیں، اُن کی حیثیت محض "وعظ" کی رہ جاتی ہے "امر بالمعروف ونہی عن المنکر" کے قرآنی فریضہ سے مقصود ہی یہ ہے کہ احکامِ قرآنی کو قانوناً نافذ کیا جائے۔ اس کے بغیر معاشرہ کی اصلاح ہو نہیں سکتی۔ حضرت عثمانؓ کے ارشاد کے مطابق یَزَعُ اللّٰہُ بِالسُّلْطَانِ اَکْثَرَ مِمَّا یَزَعُ بِالْقُرْاٰنِ۔ تنہا قرآن سے اتنی اصلاح نہیں ہوسکتی جتنی اصلاح (قرآنی) حکومت کے ذریعے ہوسکتی ہے۔ اسی لئے کہا گیا ہے کہ ؎

مومناں را تیغ با قرآں بس است (اقبالؒ)

سب سے پہلے حضور نبی اکرمؐ نے اس حکومت کو قائم کیا۔ اور وہی اس کی مرکزی اتھارٹی تھے۔ اس لئے خدا نے حضورؐ کی اطاعت کو خود خدا کی اطاعت قرار دیا جب فرمایا کہ وَمَنْ یُّطِعِ الرَّسُوْلَ فَقَدْ اَطَاعَ اللّٰہَ۔ (۴/۸۰) "جس نے رسولؐ کی اطاعت کی اس نے درحقیقت خدا کی اطاعت کی"۔ قرآن کریم نے "اَطِیْعُوا اللّٰہَ وَ اَطِیْعُوا الرَّسُوْلَ" (خدا اور رسول کی اطاعت کرو) کا جو حکم بار بار دیا ہے اس سے مراد اس نظامِ خداوندی کی اطاعت ہے جسے رسول اللہؐ نے متشکل فرمایا تھا[1]۔ چونکہ اطاعت درحقیقت

[1] تفصیل کے لئے دیکھئے میرا مقالہ "مرض، تشخیص اور علاج" شائع شدہ طلوعِ اسلام بابت مئی۔جون ۱۹۸۲ء۔

خدا کی، یعنی خدا کی کتاب کی، مقصود تھی۔ اس لئے رسول اللہؐ سے کہا گیا۔ کہ

فَاحْكُمْ بَيْنَهُمْ بِمَا أَنْزَلَ اللّٰهُ (۵/۴۸)

تم ان میں کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرو۔

اصول و جزئیات کی پوزیشن

(۲) لیکن قرآن کریم کی صورت یہ ہے کہ اس میں چند ایک احکام تو بالتصریح دیئے گئے ہیں لیکن باقی ہدایات بطور اصول دی گئی ہیں۔ اس لئے ان کی جزئیات کو خود متعین نہیں کیا۔ ایسی کتاب کو جس نے تمام نوع انسان کے لئے قیامت تک مکمل اور غیر متبدل ضابطۂ حیات بننا تھا، ہونا بھی ایسا ہی چاہیئے تھا کہ اس کے اصول و اقدار تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں لیکن ان اصولوں کی روشنی میں، جزوی احکام، ہر زمانے کے تقاضوں اور اُمت کے احوال و ظروف کے مطابق مرتب ہوتے اور بدلتے رہیں۔ اس سلسلہ میں اس نے واضح طور پہ کہہ دیا کہ جن احکام کو ہم نے صرف اصولی طور پہ دیا ہے اور ان کی جزئیات خود مرتب کر کے نہیں دیں، اس سے یہ نہ سمجھنا کہ خدا کو ایسا کرنا چاہیئے تھا لیکن یہ (معاذ اللہ) اس سے سہواً رہ گیا ہے۔ سورۂ مائدہ میں ہے۔ يٰۤاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا لَا تَسْـَٔلُوْا عَنْ اَشْيَآءَ اِنْ تُبْدَ لَكُمْ تَسُؤْكُمْ وَاِنْ تَسْـَٔلُوْا عَنْهَا حِيْنَ يُنَزَّلُ الْقُرْاٰنُ تُبْدَ لَكُمْ (۵/۱۰۱)

اے جماعت مومنین! جن امور کے متعلق کتاب اللہ خاموش ہے، ان کے متعلق خواہ مخواہ سوالات نہ کیا کرو۔ ابھی وحی کا سلسلہ جاری ہے۔ اگر تمہارے سوالات کے جواب میں، وحی کے ذریعے مزید احکام دے دیئے گئے تو ان کا نباہنا تمہارے لئے دشوار ہو جائے گا۔ سو تم بیٹھے بٹھائے اپنے اوپر مزید پابندیاں عائد کرانے کا موجب کیوں بنتے ہو؟ قَدْ سَاَلَهَا قَوْمٌ مِّنْ قَبْلِكُمْ ثُمَّ اَصْبَحُوْا بِهَا كٰفِرِيْنَ۔ (۵/۱۰۲) اس سے پہلے ایک قوم (بنی اسرائیل) ایسی حماقت کر چکی ہے۔ اس نے خواہ مخواہ اپنے اوپر قسم قسم کی پابندیاں عائد کر کے زندگی کو ناقابل برداشت زنجیروں میں جکڑ لیا۔ اور جب انہیں نباہ نہ سکے تو دین ہی سے برگشتہ ہو گئے۔ تم ایسا نہ کرنا۔ جن امور کے متعلق وحی خاموش ہے، یہ نہیں کہ ہم ان کے متعلق ہدایات دینا بھول گئے ہیں۔ ایسا دانستہ کیا گیا ہے۔ اس آیۂ جلیلہ کی تشریح نبی اکرمؐ نے اپنی ایک حدیث میں یوں فرما دی کہ:- اِنَّ اللّٰهَ فَرَضَ فَرَائِضَ فَلَا تُضَيِّعُوْهَا۔ وَحَرَّمَ حُرُمَاتٍ فَلَا تَنْتَهِكُوْهَا۔ وَحَدَّ حُدُوْدًا فَلَا تَعْتَدُوْهَا وَسَكَتَ عَنْ اَشْيَآءَ مِنْ غَيْرِ نِسْيَانٍ فَلَا تَبْحَثُوْا عَنْهَا۔

اللہ نے کچھ امور کو فرض قرار دیا ہے۔ انہیں ضائع مت کرو۔ کچھ چیزوں کو حرام قرار دیا ہے۔ ان کے پاس تک نہ پھٹکو۔ کچھ حدود متعین کی ہیں۔ ان سے تجاوز نہ کرو۔ اور دیگر امور کے متعلق دانستہ خاموشی اختیار کی ہے ان کے متعلق کرید مت کرو۔

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ زبانِ وحی جن امور کے متعلق خاموش ہے۔ ان میں ان احکام کی جزئیات شامل ہیں، جنہیں صرف اصولی طور پہ بیان کیا گیا ہے۔ باقی رہے وہ احکام جنہیں متعین طور پہ بیان کر دیا گیا ہے، ان کے متعلق بھی یہ سمجھ لینا چاہیئے کہ قرآن کریم نے نہ تو ان احوال و ظروف کا تعین کیا ہے جن کے مطابق ان احکام کو نافذ کیا جائے گا۔ اور نہ ہی ان شرائط کا ذکر ہے جن سے وہ مشروط ہوں گے۔

(مثلاً) اس میں سرقہ (چوری) کو قابلِ سزا جرم قرار دیا گیا ہے لیکن سرقہ کی قانونی تعریف (DEFINITION) خود متعین نہیں کی۔ یا (مثلاً) اس نے خمر اور میسر کو ممنوع قرار دیا ہے لیکن ان کی قسموں اور شکلوں کی تصریحات خود بیان نہیں کیں۔

بنا بریں قرآن کریم نے ان احکام کی جزئیات کا تعین جنہیں اس نے اصولی طور پر بیان کیا ہے، اور جن احکام کو بالتصریح بیان کیا ہے، ان کی شرائط و احوال کی تبیین، نظامِ حکومتِ اسلامی پر چھوڑ دی ہے۔ جو کچھ قرآن میں آیا ہے وہ تو ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہے گا لیکن ان کی تفاصیل و جزئیات، جنہیں حکومتِ قرآنی متعین کرے گی، حالات کے تقاضوں کے مطابق، بدلتی رہیں گی۔ اس طرح ثبات و تغیر کے حسین امتزاج سے کتاب اللہ، تمام نوعِ انسانی کے لئے ہمیشہ ہمیشہ کے لئے ضابطۂ زندگی بنتی چلی جائے گی۔

ان تفاصیل و جزئیات کا تعین سب سے پہلی اسلامی حکومت کے سربراہ، حضور نبی اکرمؐ نے فرمایا۔ قرآن کریم میں حضورؐ سے ارشاد ہے کہ وَشَاوِرْهُمْ فِي الْأَمْرِ۔ (3/158) "امور مملکت میں اپنے صحابہؓ سے مشورہ کیا کرو"۔ ظاہر ہے کہ جہاں تک وحی خداوندی کا تعلق ہے، اس میں کسی کے مشورہ کا تو ایک طرف خود صاحبِ وحی کے ذاتی خیالات کا بھی کوئی دخل نہیں تھا۔ (53/3-4) لہٰذا مشورہ کا حکم، ان احکامِ خداوندی کی جزئیات و تفاصیل کے متعلق تھا جنہیں خدا نے اصولی طور پر دیا تھا یا جن کی شرائط و قیود خود بیان نہیں کی تھیں۔ ان جزئیات و شرائط کو حضورؐ نے اپنے زمانے کے تقاضوں اور قومِ مخاطب کے احوال و ظروف کے

رسول اللہؐ کی متعین کردہ جزئیات

مطابق صحابہؓ کے مشورہ سے متعین فرمایا۔ ظاہر ہے کہ ان جزئیات و شرائط کے متعلق یہ مقصود نہیں تھا کہ وہ ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رہیں گی۔ اگر انہیں بھی غیر متبدل رکھنا مطلوب ہوتا تو انہیں بھی وحی کے ذریعے، قرآن کے اندر محفوظ کر دیا جاتا۔ یا جس طرح حضورؐ نے قرآن کریم مرتب اور محفوظ شکل میں اُمّت کو دیا تھا، اسی طرح اپنے فیصلوں کا مستند اور مصدقہ مجموعہ، محفوظ طور پر اُمّت کو دے جاتے۔ لیکن نہ خدا نے، قرآن کریم میں ان تفاصیل کو بیان کیا اور نہ ہی رسول اللہ نے انہیں محفوظ طور پر اُمّت کو دیا (احادیث کے متعلق حضرت ابوبکر صدیقؓ اور حضرت عمر فاروقؓ کا طرزِ عمل باب چہارم میں بتایا جا چکا ہے۔ اس کی وجہ بھی یہی تھی۔) اس سے واضح ہے کہ ان جزئیات کا ہمیشہ کے لئے غیر متبدل رکھنا نہ منشائے خداوندی تھا، نہ مقصودِ رسالت۔ حضورؐ نے اس کے برعکس، ایک ایسا اصول بیان فرمایا جس سے واضح ہو جاتا ہے کہ اُمّت کے لئے، اپنے زمانے کے اسلامی نظام کے فیصلوں کا اتباع ہی مقصودِ خدا و رسول تھا۔ آپؐ نے فرمایا کہ

عَلَيْكُمْ بِسُنَّتِي وَسُنَّةِ الْخُلَفَاءِ الرَّاشِدِينَ الْمَهْدِيِّينَ۔

(مشکوٰۃ۔ باب الاعتصام بالکتاب والسنۃ)

تم پر میرے طریقے اور میرے صاحبِ رشد و ہدایت جانشینوں کے طریقے کی پیروی لازم ہے۔

حضورؐ کا یہ ارشادِ گرامی قرآن کریم میں بیان کردہ اس حقیقت کی تبیین ہے کہ

وَمَا مُحَمَّدٌ إِلَّا رَسُولٌ ۚ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ ۚ أَفَإِنْ

مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰۤى اَعْقَابِكُمْ ..... (۳/۱۴۴)

محمدؐ بجز اس نیست کہ اللہ کے رسولؐ ہیں۔ ان سے پہلے بھی بہت سے رسول ہو گزرے ہیں۔ سو اگر یہ وفات پا جائیں یا قتل کر دیئے جائیں تو کیا تم (یہ سمجھ کر کہ دین کا نظام آپؐ کی ذات تک محدود تھا) پھر اُلٹے پاؤں پھر جاؤ گے۔؟

بات بالکل واضح ہے کہ دین کا نظام، حضورؐ کی ذات تک محدود نہیں تھا۔ اسے آپؐ کے بعد بھی بدستور آگے چلنا تھا۔ اس نظام میں جس طرح حضورؐ کی زندگی میں، مرکز نظام کی اطاعت "خدا اور رسولؐ کی اطاعت" تھی۔ یہی شکل حضورؐ کے جانشینوں کے زمانے میں بھی رہے گی۔ اسی نظام کو قرآن کریم نے "سبیل المؤمنین" کہہ کر پکارا ہے یعنی جماعت مومنین کا راستہ۔ (۴/۱۱۵)

ہم اس بحث میں نہیں پڑنا چاہتے کہ ایسا کیوں ہوا، لیکن (عام عقیدہ کے مطابق) خلافت راشدہ اوّلین چار خلفاءؓ تک محدود ہو کر رہ گئی۔ اس لئے حضورؐ نے جو فرمایا تھا کہ "تم پر میری اور میرے خلفاء راشدینؓ کے طریقے کی پیروی لازم ہے"۔ اس کا اب یہی مفہوم، حضورؐ کے بعد خلفائے راشدینؓ (چار خلفاءؓ) کی سنت (طریق) لیا جاتا ہے۔ لیکن یہ نہ تو حکم خداوندی تھا، نہ ارشادِ نبویؐ کہ خلافتِ راشدہ، چار خلفاء تک محدود رہے گی۔ دین کے نظام کا تو ہمیشہ کے لئے جاری رہنا مطلوب تھا۔ یہ اتفاق تھا (اور امت بلکہ نوعِ انسانی کی بدقسمتی) کہ وہ نظام زیادہ عرصہ تک قائم نہ رہا۔ لیکن اگر وہ قائم رہتا (اور جب تک قائم رہتا) تو اس کی اطاعت "خلافتِ راشدہ" کی اطاعت قرار پاتی۔ یعنی اُمت کے لئے اطاعت اپنے زمانے کے نظامِ اسلامی کی لازم ہوتی، نہ کہ کسی سابقہ زمانہ کے نظام کی۔ اور اس کی وجہ حضورؐ نے خود ہی یہ کہہ کر بیان فرما دی کہ:

الناس اشبہ بزمانھم من اسلافھم۔ (جاحظ البیان والتبیین)

لوگ اپنے اسلاف کے مقابلہ میں اپنے زمانے کے زیادہ مشابہ ہوتے ہیں۔

اسی بنا پر امام ابوحنیفہؒ فرمایا کرتے تھے کہ

اگر نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) مجھے پاتے اور میں آپ کو پاتا (یعنی ہم دونوں ہمعصر ہوتے) تو آپؐ میرے اکثر اقوال کو اختیار فرما لیتے۔ دین اس کے سوا کیا ہے کہ وہ ایک اچھی اور عمدہ رائے کا نام ہے۔ (تاریخ بغدادی۔ جلد ۱۳۔ صفحہ ۲۹)

مطلب یہ ہے کہ نبی اکرمؐ پیش آمدہ معاملات کے فیصلے، قرآن کے اصولی احکام کی روشنی میں صحابہؓ کے مشورہ سے کیا کرتے تھے۔ اگر میں (یعنی امام اعظمؒ) اس زمانے میں ہوتا تو آپؐ اکثر معاملات میں میری رائے قبول فرما لیتے اور اس طرح میری رائے شریعت کا حکم قرار پا جاتی۔

زمانے کے تقاضوں کے مطابق فیصلے

امام اعظمؒ کے اسی مسلک کی تشریح کرتے ہوئے بغدادی نے لکھا ہے کہ:

ابوعوانہ نے بیان کیا کہ میں ایک روز ابوحنیفہؒ کے پاس بیٹھا تھا کہ سلطان کی طرف سے ایک ایلچی

آیا۔ اس نے کہا کہ امیر نے پوچھا ہے کہ ایک آدمی نے شہد کا چھتہ چرا لیا ہے۔ اس کے بارے میں کیا حکم ہے؟ آپ نے بلاکسی ہچکچاہٹ کے جواب دیا کہ اس کی قیمت اگر دس درہم ہو تو اس کا ہاتھ کاٹ دو۔ ایلچی چلا گیا تو میں نے ابوحنیفہؒ سے کہا کہ تم خدا سے نہیں ڈرتے۔ رسول اللہ کا ارشاد ہے کہ پھل پھلواری کی چوری میں ہاتھ نہیں کاٹا جا سکتا۔ فوراً اس کی مدد کو پہنچئے۔ ورنہ اس شخص کا ہاتھ کاٹا جائے گا۔ آپ نے بلاکسی ہچکچاہٹ کے کہا کہ وہ حکم گذر چکا اور ختم ہو چکا ہے

(بغدادی - جلد ۱۳ - صفحہ ۴۹)

مطلب واضح ہے کہ حضورؐ کا وہ فیصلہ اس زمانے کے حالات کے مطابق تھا۔ آج حالات بدل چکے ہیں۔ اس لئے اس فیصلہ میں بھی تبدیلی ہونی چاہئے۔ اسی اصول کے مطابق "تعلیل الاحکام" میں آیۂ وَمَآ اَرۡسَلۡنٰکَ اِلَّا رَحۡمَۃً لِّلۡعٰلَمِیۡنَ - (۲۱/۱۰۷) کی تفسیر میں کہا گیا ہے کہ

زمانے کے بدلنے سے نئے نئے مصالح پیدا ہوتے رہتے ہیں۔ ایسی حالت میں اگر صرف منصوص ہی کا اعتبار کیا جائے تو لوگ سخت مصیبت میں پھنس جائیں۔ یہ بات رحمت کے منافی ہوگی۔

(تعلیل الاحکام - صفحہ ۲۸)

یعنی حضورؐ کے رحمت للعالمین (تمام زمانوں کے لئے رحمت) ہونے کا تقاضا ہے کہ ہر زمانے کے حالات کے مطابق احکام نافذ کئے جائیں۔ امام ابن قیمؒ نے اسے اور بھی واضح الفاظ میں بیان کیا ہے۔ جب کہا کہ:

شریعت اللہ کا مقصود بندوں میں عدل وانصاف کا قیام ہے۔ جس طریق کے ذریعے عدل وانصاف قائم کیا جائے گا وہی دین ہوگا۔ اسے دین کے خلاف نہیں کہا جائے گا۔ (الطرق الحکمیہ)

یعنی دین کے اصول تو ہمیشہ غیر متبدل رہیں گے لیکن ان اصولوں پر عمل اپنے اپنے زمانے کے حالات کے مطابق کیا جائے گا۔ علامہ اقبالؒ نے اس اصول کے متعلق اپنے خطبات (تشکیل جدید) میں بڑی بصیرت افروز بحث کی ہے۔ وہ پہلے شاہ ولی اللہؒ کا یہ قول نقل کرتے ہیں کہ:-

پیغمبر کا طریق یہ ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص قوم تیار کرتا ہے اور اسے ایک عالمگیر شریعت کے لئے بطور خمیر استعمال کرتا ہے، اس مقصد کے لئے وہ ان اصولوں پر زور دیتا ہے جو تمام نوع انسان کی معاشرتی زندگی کو اپنے سامنے رکھتے ہیں لیکن ان اصولوں کا نفاذ اس قوم کی عادات وخصائل کی روشنی میں کرتا ہے جو اس وقت اس کے سامنے ہوتی ہے۔ اس طریق کار کی رو سے اس رسول کے احکام اس قوم کے لئے خاص ہوتے ہیں۔ اور چونکہ ان احکام کی ادائیگی بجائے خویش مقصود بالذات نہیں ہوتی اس لئے انہیں آنے والی نسلوں پر من وعن نافذ نہیں کیا جا سکتا۔ (چھٹا خطبہ)

اس کے بعد علامہ اقبالؒ لکھتے ہیں کہ:-

غالباً یہی وجہ تھی کہ امام اعظمؒ نے جو اسلام کی عالمگیریت کی خاص بصیرت رکھتے تھے اپنی فقہ کی تدوین میں حدیثوں سے کام نہیں لیا۔ انہوں نے تدوین فقہ میں استحسان کا اصول وضع کیا جس کا مفہوم یہ ہے کہ قانون وضع کرتے وقت اپنے زمانے کے تقاضوں کو سامنے رکھنا چاہئے۔ اس سے یہ واضح ہو جاتا ہے

کہ انہوں نے اپنی فقہ کا مدار حدیثوں پر کیوں نہیں رکھا۔

اس کے بعد انہوں نے (علامہ اقبالؒ نے) لکھا ہے کہ

> اسلام کا پیش کردہ تصور یہ ہے کہ حیاتِ کلی کی روحانی اساس تو ازلی اور ابدی ہے لیکن اس کی نمود تغیرات کے پیکروں میں ہوتی ہے جو معاشرہ حقیقتِ مطلقہ کے متعلق اس قسم کے تصور پر متشکل ہو۔ اس کے لئے ضروری ہوگا کہ وہ اپنی زندگی میں مستقل و تغیر پذیر عناصر میں موافقت پیدا کرے۔ اس کے لئے ضروری ہے کہ اس کے پاس اپنی اجتماعی زندگی کے نظم و ضبط کے لئے مستقل اور ابدی اصول ہوں۔ اس لئے کہ اس دنیا میں جہاں تغیر کا دور دورہ ہے۔ ابدی اصول ہی وہ محکم سہارا بن سکتے ہیں جن پر انسان اپنا پاؤں ٹکا سکے۔ لیکن ابدی اصولوں کے متعلق اگر یہ سمجھ لیا جائے کہ ان کے دائرے میں تغیر کا امکان ہی نہیں — وہ تغیر جسے قرآن نے عظیم آیات اللہ میں شمار کیا ہے — تو اس سے زندگی، جو اپنی فطرت میں متحرک واقع ہوئی ہے۔ یکسر جامد و متصلب بن کر رہ جائے گی۔ یورپ کو عمرانی اور سیاسی زندگی میں جو ناکامی ہوئی اس کی وجہ یہ ہے کہ ان کے ہاں کوئی ابدی اور غیر متبدل اصولِ حیات نہیں تھے۔ اس کے برعکس گذشتہ پانچ سو سال میں اسلام جس قدر جامد اور غیر متحرک بن کر رہ گیا ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مسلمانوں نے مستقل اقدار کے دائرے میں اصولِ تغیر کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ (ایضاً)

اس کے بعد وہ لکھتے ہیں کہ

> یہ سوال کہ اسلامی قوانین شریعت میں ارتقاء کی گنجائش ہے یا نہیں، بڑا اہم ہے اور بہت سی ذہنی جدوجہد کا متقاضی۔ اس سوال کا جواب یقیناً ہاں میں ہونا چاہئے بشرطیکہ اسلامی دنیا عمرؓ کی روح کو لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمرؓ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب ہے۔ وہ جسے رسول اللہؐ کی حیاتِ ارضی کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ
>
> حَسْبُنَا كِتَابُ اللّٰهِ
>
> ہمارے لئے خدا کی کتاب کافی ہے

دورِ فاروقی میں اس اصول پر عمل

اب ہم اس دور کی کچھ مثالیں سامنے لاتے ہیں۔ (یعنی دورِ فاروقی کی) جس میں، یہ "روحِ عمرؓ" عملی پیکروں میں کارفرما تھی۔ جب حضرت عمرؓ نے خلافت کی ذمہ داریاں سنبھالی ہیں تو حضورؐ کے زمانہ کو گزرے ہوئے تھوڑا سا عرصہ ہوا تھا — یعنی یہی دو تین برس لیکن چونکہ اب مملکت کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا تھا۔ اس لئے حالات میں کافی تبدیلی آ رہی تھی۔ اسی حقیقت کے پیشِ نظر آپ نے (حضرت عمرؓ نے) فرمایا تھا کہ:

> بے شک خدائے بزرگ و برتر حالات اور زمانے کے تقاضوں سے لوگوں کے لئے نئے نئے مسائل پیدا کرتا رہتا ہے۔ (کتاب المیزان)۔

چنانچہ ان کا طریق کار یہ تھا کہ جب کوئی نیا معاملہ سامنے آتا آپ سابقہ ادوار کی حکومتوں (یعنی رسالت مآبؐ

اور عہدِ صدیقیؓ) کو دیکھتے۔ اگر وہاں سے کوئی ایسا فیصلہ ملتا جو اس معاملہ کے تقاضوں کو پورا کر دیتا تو اسے من و عن نافذ کر دیتے۔ اگر اس میں کسی ترمیم و تنسیخ یا حک و اضافہ کی ضرورت ہوتی تو ترمیم شدہ فیصلہ صادر فرما دیتے اور عند الضرورت اپنا جدید فیصلہ نافذ کر دیتے۔ اور بعض اوقات (حالات کی تبدیلی کے پیشِ نظر) خود اپنے سابقہ فیصلہ میں بھی تبدیلی کر دیتے۔ یعنی وحی کے متعین کردہ احکام و اصول اپنی جگہ غیر متبدل رہتے لیکن ان کے عملی نفاذ کی شکلوں اور جزئیات میں حالات کے مطابق تبدیلیاں ہوتی رہتیں۔ ثبات و تغیر کا یہی حسین امتزاج ہے جس سے اسلام ایک عالمگیر اور ابدی نظامِ حیات بن سکتا ہے اور عہدِ فاروقی اس کی درخشندہ مثال پیش کرتا ہے۔

---

(۱) نظامِ مشاورت

کسی سابقہ حکم کا من و عن نافذ کر دینا کچھ بھی مشکل نہیں ہوتا، لیکن ان احکام کا اپنے زمانے کے حالات کے مطابق نافذ کرنا یا غیر متبدل اصولوں کی جزئیات کا پیشِ نظر تقاضوں کے مطابق متعین کرنا، بڑا کٹھن مرحلہ ہوتا ہے، بالخصوص جب ان احکام و جزئیات نے دین کی حیثیت اختیار کرنی ہو۔ اسی مشکل کے پیشِ نظر، قرآن کریم نے رسول اللہ کو بھی حکم دیا کہ ان امور میں اپنے رفقاء سے مشورہ کیا کرو (۳/۱۵۸) اور حضورؐ کے بعد اُمت سے بھی کہا کہ ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے پائیں گے (۴۲/۳۸) یہ وجہ ہے جو دین کے نظام میں مشاورت کو بنیادی اہمیت حاصل ہے۔

یورپ نے ملوکیت اور تھیاکریسی سے تنگ آ کر جمہوریت (ڈیماکریسی) کا نظام وضع کیا اور اس کے حق میں ایسی ڈگڈگی بجائی کہ ساری دُنیا اُسے آیۂ رحمت سمجھنے لگ گئی۔ ان کی دیکھا دیکھی مسلم اقوام نے بھی اُسے اپنے ہاں رائج کر لیا اور طُرفہ تماشہ یہ کہ اسے عین مطابقِ اسلام قرار دے دیا چنانچہ

مغربی جمہوریت اور اسلام

آج اس نظریہ کو مسلّمہ کے طور پر تسلیم کیا جاتا ہے کہ "جمہوریت عین اسلام" ہے بلکہ یہ کہ جمہوریت کی طرح ہی اسلام نے ڈالی تھی۔ یہ تصوّر غلط اور یکسر اسلام کے خلاف ہے۔ مغربی جمہوریت کا بنیادی اصول یہ ہے کہ اقتدار مطلق (Sovereignty) عوام کو حاصل ہے۔ عوام کے نمائندے جس قسم کا جی چاہے قانون مرتب کر سکتے ہیں۔ انہی کا فیصلہ حرفِ آخر ہے۔ ان سے بالا کوئی اتھارٹی نہیں۔ یہ سیکولرازم ہے جو اسلام کی نقیض ہے۔ اسلام میں اقتدار اعلیٰ کسی ایک ملک کے عوام یا ان کے نمائندگان تو ایک طرف، پوری نوعِ انسان کو بھی حاصل نہیں۔ اقتدار مطلق صرف خدا کو حاصل ہے اور اسلامی نظام (یعنی اُمت کے نمائندگان) کتاب اللہ کے حدود کے اندر رہتے ہوئے قوانین مرتب کر سکتے ہیں۔ مغربی انداز جمہوریت اور اسلام کے نظامِ مشاورت میں یہ بنیادی فرق ہے جسے کبھی نظرانداز نہیں کرنا چاہئے۔ اسلامی نظام کو آپ "کنٹرولڈ ڈیماکریسی" کہہ سکتے ہیں یعنی وہ جمہوریت جس

پر قرآن کا کنٹرول ہو۔

قرآن کریم نے امت کے لئے مشاورت کو ضروری تو قرار دیا لیکن اپنے مخصوص انداز کے مطابق مشاورت کی مشینری خود وضع نہیں کی۔ اسے امت کی صوابدید پر چھوڑ دیا ہے کہ وہ اپنے زمانے کے تقاضوں کے مطابق مشاورت کا طریق کار خود متعین کرے۔

مشاورت کی مشینری

خلافت راشدہ کے زمانے میں زندگی بڑی سادہ سی تھی اس لئے مشاورت کی مشینری بھی کچھ ایسی وسیع و عریض نہیں تھی۔ اس کے لئے طریق کار کیا تھا، اسے ساتویں باب کے شروع میں بیان کیا جا چکا ہے آپ اس پر ایک نظر پھر دیکھ لیں۔ مختصراً" امیرالمومنین کی مجلس مشاورت" اعیانِ مدینہ تک محدود تھی اور اہم معاملات میں صوبوں کے نمائندوں کو بھی بلا لیا جاتا تھا۔ مجلس مشاورت میں حضرت علیؓ، حضرت عثمانؓ، حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ، حضرت معاذ بن جبلؓ، حضرت ابی بن کعبؓ، حضرت زید بن ثابتؓ جیسے اولوالعزم صحابہؓ شامل تھے۔ یہ سب معمر اور پختہ کار تھے۔

نوجوانوں اور عورتوں سے مشورہ

لیکن حضرت عمرؓ نوجوانوں کی بھی حوصلہ افزائی فرماتے رہتے۔ اور اکثر معاملات میں ان سے بھی مشورہ لیا کرتے حتیٰ کہ عورتوں سے بھی۔ عام انتظامی امور اور بندوبست کے سلسلہ میں آپ ذمی رعایا کو بھی شریک مشاورت کر لیتے تھے۔ کیونکہ ان معاملات کا تعلق بیشتر ان سے ہوتا تھا۔ آپ دیگر مملکتوں کے آئین و قوانین کا بھی مطالعہ کرتے رہتے تھے۔ واضح رہے کہ اس زمانے میں غیر مسلم بلا روک ٹوک مکہ معظمہ آتے جاتے تھے (کتاب الخراج۔ امام ابو یوسف۔ بحوالہ شبلی نعمانی) دیگر ممالک کے احوال و کوائف اور قوانین و ضوابط کے متعلق ان کے ذریعے بھی معلومات حاصل کی جاتی تھیں۔

مغربی انداز جمہوریت میں یہ سوال بڑی اہمیت رکھتا ہے کہ سربراہ مملکت پارلیمان کی اکثریت کے فیصلوں کا پابند ہوتا ہے یا اسے ویٹو کے اختیارات بھی حاصل ہوتے ہیں۔

اکثریت کے فیصلے

ہمارے ہاں آئین سازی کے سلسلہ میں، اس موضوع پر بڑی بحث و تمحیص ہوتی رہی اور (جیسا کہ عام طور پر ہوتا ہے) اسے اسلامی معیار کے مطابق پرکھنے کے مدعی اپنے اپنے نقطۂ نگاہ کی تائید اور مخالفین کی تردید میں صدر اول سے اسناد پیش کرنے لگے۔ آگے بڑھنے سے پہلے ہم اس اصول کی وضاحت کر دینا ضروری سمجھتے ہیں کہ اسلامی نظام میں یہ انداز ہی صحیح نہیں کہ جو معاملہ پیش آئے اس کے فیصلہ کے لئے صدر اول کے طریق کو بطور سند پیش کر دیا جائے۔ اول تو اس دور کی تاریخ میں مخالف اور موافق ہر قسم کے شواہد اور اقوال مل جاتے ہیں۔ اور مسلمانوں میں صدیوں سے چلے آنے والے اختلافات کا بنیادی

۱؎ ابن الجوزی بحوالہ الفاروق (مطبوعہ بیروت صفحہ ۱۷۰) ۲؎ یاد رکھئے۔ غیر مسلموں سے مشورہ لیا جا سکتا ہے، انہیں شریکِ حکومت نہیں کیا جا سکتا۔ جس حکومت کا مقصد کتاب اللہ کے احکام کا عملی نفاذ ہو، اس میں وہ لوگ کیسے شریک ہو سکتے ہیں جو اس کتاب پر ایمان ہی نہ رکھیں۔

سبب یہی ہے)۔ دوسرے، قرآنی نظام کی رُو سے، کسی سابقہ دَور کا کوئی فیصلہ، آنے والے دَور کے لئے قولِ فیصل نہیں قرار پا سکتا۔ اُن کا فیصلہ اُن کے زمانے کے احوال و ظروف کے مطابق تھا۔ ہمارا فیصلہ ہمارے زمانے کے تقاضوں کے مطابق۔ سابقہ ادوار کے فیصلوں سے بطور نظائر تو فائدہ اُٹھایا جا سکتا ہے۔ انہیں سند اور حرفِ آخر قرار نہیں دیا جا سکتا۔ بنا بریں، اس قسم کی بحثیں، بجز اس کے کہ ان سے اختلافات بڑھیں، کوئی مفید مطلب نتیجہ مرتب نہیں کر سکتیں۔

اس سوال کے متعلق کہ سربراہِ مملکت، اکثریت کے فیصلوں کا پابند ہے یا اسے ویٹو کا اختیار بھی حاصل ہے۔ صدرِ اوّل کی تاریخ میں دونوں قسم کے شواہد مل جاتے ہیں۔ ملا یسے واقعات بھی جن میں امیرالمومنینؓ نے اکثریت کے فیصلوں کو تسلیم کر لیا ہو۔ حتیٰ کہ طبقات ابن سعد میں عمالِ حکومت کے نام حضرت عمرؓ کی یہ ہدایت بھی ملتی ہے کہ "جس معاملہ میں کوئی صریح حکم موجود نہ ہو، اس میں صحابہؓ کی اکثریت کی رائے کے مطابق فیصلہ کرنا چاہئے"۔ اور حضرت صدیق اکبرؓ اور عمر فاروقؓ کے ایسے فیصلے بھی جو اکثریت کی رائے کے خلاف تھے۔ (مثلاً) رسول اللہؐ کی وفات کے بعد، مانعین زکوٰۃ کا جو پہلا معاملہ زیرِ غور آیا تو حضرت ابوبکرؓ کی رائے یہ تھی کہ ان کے خلاف جنگ کی جائے اور صحابہؓ کی بڑی اکثریت اس کے خلاف تھی۔ (ان میں حضرت عمرؓ بھی شامل تھے) لیکن حضرت ابوبکرؓ نے اکثریت کی رائے کو نظر انداز کرتے ہوئے عمل اپنے فیصلے کے مطابق کیا۔ اور اس فیصلے کی اطاعت، مخالف و موافق سب نے بدل و جان کی۔ (یہی اُس دَور کی خوبی تھی) اس ضمن میں دو اہم امور پیشِ نظر رکھنے کے قابل ہیں۔ ایک تو یہ کہ ہر معاملہ کے متعلق اصولی ہدایت قرآن کریم میں موجود ہوتی تھی اور فیصلہ طلب معاملہ صرف یہ ہوتا تھا کہ اس اصول پر عمل کس طرح کیا جائے، دوسرے یہ کہ امیرالمومنین اگر اکثریت کی رائے کو مسترد کرتا تھا تو وہ ایسا دھاندلی سے نہیں کرتا تھا۔ وہ اپنے فیصلے کے حق میں دلائل و براہین پیش کرتا اور اختلاف رکھنے والوں کو مطمئن کرتا۔ وہ جو کچھ کرتا کھلے بندوں کرتا اور اس کے لئے قرآنی سند پیش کرتا (مثلاً) جب عراق کی زمینوں کا سوال سامنے آیا ہے (جس کی تفصیل معاشی نظام میں پیش کی جائے گی) تو صحابہؓ کی اکثریت نے حضرت عمرؓ کی رائے سے اختلاف کیا۔ اس پر کئی دنوں تک بحث ہوتی رہی اور بحث میں ہر شخص پوری جرأت اور بے باکی سے اپنا نقطۂ نظر پیش کرتا رہا۔ (اسی کو روحِ جمہوریت کہتے ہیں)۔ اس پر بھی معاملہ جب کسی فیصلہ کُن مرحلہ تک نہ پہنچ سکا تو حضرت عمرؓ نے مزید غور و فکر کے لئے مہلت چاہی۔ اس مہلت کے وقفہ کے بعد، جب انہوں نے اس مسئلہ کو مجلسِ مشاورت کے سامنے دوبارہ پیش کیا تو اس سلسلہ میں جو افتتاحی تقریر فرمائی۔ وہ غور طلب ہے۔ آپ نے فرمایا:۔

سند کتاب اللہ کی ہوتی تھی

میں نے آپ حضرات کو اس لئے تکلیف دی ہے کہ آپ اس امانت کے بارے میں میرا ہاتھ بٹائیں جسے میرے کندھوں پر رکھ دیا گیا ہے۔ اس لئے کہ میں بھی آپ ہی جیسا ایک انسان ہوں۔ آج آپ حضرات نے حق کے مطابق فیصلہ کرنا ہے۔ بعض لوگوں نے میری مخالفت کی ہے اور بعض نے موافقت۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ

میری بات محض اس لئے مان لیں کہ وہ میری بات ہے۔ آپ لوگوں کے پاس کتاب خداوندی ہے جو حق کے ساتھ بات کرتی ہے۔ اگر میں بھی کسی معاملہ میں لب کشائی کرتا ہوں تو حق کے لئے ایسا کرتا ہوں۔
اس کے بعد آپ نے فرمایا کہ اس دوران میں غور و فکر کے بعد مجھے قرآن کریم سے ایسی راہ نمائی مل گئی ہے جس کی روشنی میں اس مسئلہ کا حل بآسانی ہو سکتا ہے اور وہ یہ آیات ہیں۔ اس پر مخالفین نے کہا کہ اب ہمارا سینہ بھی کشادہ ہو گیا ہے اور ہم آپ سے اتفاق کرتے ہیں۔ یہ تھا اختلافی امور میں انداز اپنی رائے کے پیش کرنے کا۔ اور اسی بنا پر حضرت ابن مسعودؓ فرمایا کرتے تھے کہ
جب عمرؓ کوئی راہ اختیار کر لیتے تو وہ بات ہمارے لئے آسان ہو جاتی تھی۔
اس کے باوجود، آپ اپنی رائے اور وحی کے بنیادی فرق کو ہمیشہ ملحوظ رکھتے تھے۔ آپ نے ایک دفعہ

وحی اور اپنی رائے میں فرق

کسی معاملہ میں رائے دی تو کسی نے کہا کہ "یہ اللہ اور عمرؓ کی رائے ہے"۔ آپ نے اُسے فوراً ڈانٹا اور فرمایا کہ "تو نے یہ بہت بڑی بات کہی ہے، یہ صرف عمرؓ کی رائے ہے۔ اگر درست ہے تو اللہ کی طرف سے ہے، اور غلط ہے تو عمرؓ کی طرف سے ہے۔" اس کے بعد تھوڑی دیر کے لئے خاموش رہے۔ اور پھر فرمایا کہ "یاد رکھو! رائے غلط بھی ہو سکتی ہے۔ اسے امت کے لئے سنت نہ بناؤ۔" اس باب میں وہ اس قدر محتاط تھے کہ اپنی زندگی کے آخری سانس میں، جب جسم سے اس قدر خون بہ رہا تھا اور آپ درد کی شدت سے نڈھال تھے، آپ نے اپنے بیٹے (حضرت عبداللہ بن عمرؓ) سے کہا کہ "وہ ہڈی لاؤ۔ جس پر میں نے دادا کے حصہ کے متعلق کچھ لکھا تھا۔" اس سے مقصد یہ تھا کہ اس تحریر کو مٹا دیا جائے۔ بیٹے نے کہا کہ آپ اس وقت سخت تکلیف میں ہیں۔ یہ کام آپ کی طرف سے ہم بھی کر سکتے ہیں۔ لیکن آپ نے سختی سے کہا کہ تم اس کی اہمیت اور میری ذمہ داری کو نہیں سمجھتے۔ جاؤ۔ وہ ہڈی لاؤ۔ چنانچہ آپ اطمینان سے نہ بیٹھے جب تک وہ ہڈی نہ آ گئی۔ اور آپ نے اپنی تحریر کو اپنے ہاتھوں سے نہ مٹا ڈالا۔ —— احتیاط یہ تھی کہ عمرؓ کی رائے بعد میں آنے والوں کے لئے سند نہ بن جائے۔

آئیے! اب ہم دیکھیں کہ خدا کی وحی اور اپنی رائے میں فرق کرنے والوں کے دور میں قانون سازی کا طریق کار کیا تھا —— یہ گوشہ گہری توجہ اور غور و فکر کا متقاضی ہے کہ اس میں ثبات و تغیر کا وہ امتزاج جو دین کی ابدیت کا ضامن ہے، بڑے حسین انداز میں نکھر کر ہمارے سامنے آتا ہے۔

---

(۲) قانون سازی کا طریق

اسلامی مملکت کے متعلق ہم دیکھ چکے ہیں کہ وہ قرآنی احکام و ضوابط کی تنفیذ، اور اس کے اصول و اقدار کی ترویج کا ذریعہ ہے۔ اس کے لئے اس کا طریق کار یہ ہے کہ ہر دَور کی حکومت :

(۱) اپنے سے پہلے دور کی حکومت کے فیصلوں کو علیٰ حالہٖ قائم رکھتی ہے۔

(۲) لیکن اگر زمانے کے بدلے ہوئے حالات کے مطابق، ان میں کسی ردّ و بدل کی ضرورت ہوتی ہے تو وہ ان میں مناسب ترمیم و تنسیخ اور حک و اضافہ کر دیتی ہے۔ اور

(۳) اگر کسی معاملہ کے متعلق پہلے سے کوئی فیصلہ موجود نہ ہو تو وہ نیا فیصلہ صادر کر دیتی ہے لیکن

(۴) سابقہ فیصلوں میں تغیر و تبدل ہو یا کسی نئے فیصلہ کا صدور، اس کا کوئی اقدام قرآنی حدود سے تجاوز نہیں کر سکتا۔ اقبالؒ کے الفاظ میں، اس کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ آزادی کی فضائے بسیط میں اڑنے والے پرندے کی طرح ؎

پرد در وسعتِ گردوں یگانہ — نگاہِ او بشاخِ آشیانہ

یہ "شاخِ آشیانہ" خدا کی کتاب عظیم ہے جسے اس نے حبل اللہ (اللہ کی محکم رسی) اور عروۃ الوثقیٰ (ناقابلِ شکست سہارا) کہہ کر پکارا ہے۔ اس "سہارے" کو حضرت عمرؓ نہایت مضبوطی سے تھامے ہوئے تھے۔ انہوں نے جابیہ کے خطبہ میں فرمایا:-

قرآن کے مطابق احکام

> مجھے اللہ نے جو حکومت عطا کی ہے اس کی اصلاح صرف تین چیزوں سے ہو سکتی ہے۔ امانت کی ادائیگی۔ (مجرمین اور مخالفین کی) قوت کے ساتھ گرفت۔ اور کتاب خداوندی کے مطابق حکم دینا۔

اپنے ایک اور خطاب میں فرمایا:-

> حاکم کا سب سے بڑا فرض یہ ہے کہ وہ دیکھے کہ رعایا ان فرائض کا لحاظ کر رہی ہے یا نہیں، جو اللہ نے ان پر عائد کر رکھے ہیں۔ ہم تمہیں انہی باتوں کا حکم دیں گے جن کا اللہ نے حکم دیا ہے اور ان چیزوں سے روکیں گے جن سے اللہ نے روکا ہے۔

یہ واقعہ مشہور ہے کہ جب حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ لوگ اپنی بیویوں کا مہر مقرر کرنے میں بڑی افراط سے کام لے رہے ہیں تو آپ نے ایک اجتماع میں اس کا ذکر کیا اور چاہا کہ مہر کی زیادہ سے زیادہ حد مقرر کر دی جائے۔ اس پر ایک کونے سے ایک عورت کی آواز آئی کہ یہ کیا؟ اللہ تعالیٰ نے تو فرمایا ہے کہ وَ اٰتَیۡتُمۡ اِحۡدٰہُنَّ قِنۡطَارًا فَلَا تَاۡخُذُوۡا مِنۡہُ شَیۡئًا۔ (۴/۲۰) "اور تم نے بیویوں میں سے کسی کو ڈھیروں مال بھی دے دیا ہو تو اس میں سے کچھ واپس نہ لو" حضرت عمرؓ یہ سن کر بول اٹھے کہ عورت نے سچ کہا ہے، عمرؓ غلطی پر تھا۔

(ضمناً) ہم سمجھتے ہیں کہ اگر یہ روایت صحیح ہے تو حضرت عمرؓ نے یہ بات اصول مساوات کی اہمیت اور قرآن کے مطابق بات کرنے کے سلسلہ میں لوگوں کی حوصلہ افزائی کے لئے کہی ہوگی، ورنہ قرآن کے اس حکم سے یہ لازم نہیں آتا کہ مہر پر کوئی پابندی عائد نہیں کی جا سکتی۔ اوّل تو اس آیت میں صرف یہ کہا گیا ہے کہ تم جس قدر مہر مقرر یا ادا کر چکے ہو، اس میں سے کچھ واپس نہیں لے سکتے۔ دوسرے یہ کہ قرآن نے جس بات کو مطلق (بلا قیود و شرائط) چھوڑا ہے۔ اسلامی نظام، مصالح امت کے پیشِ نظر اسے مقید کر سکتا ہے یعنی اس پر شرائط عاید کر سکتا ہے۔ بہر حال یہ ایک ضمنی گوشہ تھا۔ ہم کہہ یہ رہے تھے کہ خلافت فاروقی

میں بھی اصلاً و اساساً اطاعت احکام خداوندی ہی کی تھی۔ باقی رہیں ان احکام کی جزئیات اور ان کے تعین کا طریق کار۔ سو اس باب میں حضرت عمرؓ نے اصولاً ان فیصلوں کو برقرار رکھا جو ان سے پہلی حکومتوں (عہدِ رسالت مآبؐ اور دَورِ صدیقیؓ) نے صادر کئے تھے، لیکن تغیرِ حالات کے ماتحت جن فیصلوں میں کسی تبدیلی کی ضرورت محسوس ہوئی، ان میں تبدیلی بھی کر دی۔ کتب روایات میں ان اختلافی فیصلوں کی تفاصیل موجود ہیں ہم ان میں سے چند ایک بطور مثال پیش کرتے ہیں:-

اختلافی فیصلے

(۱) سب سے پہلی مثال تو وہ ہے جو آج تک اہل حدیث اور اہل فقہ حضرات میں مابہ النزاع چلی آ رہی ہے۔ روایات میں ہے کہ اگر کوئی شخص ایک وقت تین دفعہ طلاق دے تو رسول اللہ اور حضرت صدیق رضہ کے زمانے تک اُسے ایک طلاق ہی شمار کیا جاتا تھا۔ حضرت عمرؓ کے ابتدائی زمانہ خلافت میں دو سال تک یہی قانون رہا۔ لیکن اس کے بعد حضرت عمرؓ نے دیکھا کہ لوگ اس باب میں غیر محتاط ہوتے جا رہے ہیں تو انہوں نے فیصلہ کیا کہ ایسی طلاقیں تین شمار ہوں گی (یعنی یہ ایسی طلاق متصور ہو گی جس کے بعد میاں بیوی آپس میں نکاح نہیں کر سکیں گے)۔

(ضمناً۔ ہماری بصیرت کے مطابق قرآن کریم کی رُو سے "تین طلاقوں" کا مفہوم اور قاعدہ کچھ اور ہے اس کی وضاحت میری کتاب "قرآنی قوانین و اقدار" میں ملے گی۔ اس روایت کو جس مقصد کے لئے درج کیا گیا ہے، وہ ذرا آگے جا کر سامنے آئے گا۔)

(۲) رسول اللہ کے زمانے میں قانون یہ تھا کہ اگر کوئی غیر مسلم اسلام قبول کرتا تو جائیداد منقولہ اور غیر منقولہ اس کے پاس رہتی لیکن حضرت عمرؓ نے اس میں یہ تبدیلی کر دی کہ اس کی جائیداد غیر منقولہ اسی بستی کے غیر مسلموں میں تقسیم کر دی جاتی اور اس کی کفالت کے لئے حکومت کی طرف سے باقی مسلمانوں کی طرح وظیفہ مقرر کر دیا جاتا۔

(۳) رسول اللہ کے زمانے میں شراب خوار کو جوتے وغیرہ مار کر چھوڑ دیا جاتا تھا۔ حضرت ابوبکر صدیقؓ نے شرابی کی سزا چالیس کوڑے مقرر کی۔ اور حضرت عمرؓ نے اُسے بڑھا کر اسّی کوڑے کر دیا۔

(۴) قرآن کریم نے صدقات میں مؤلفۃ القلوب کا حصہ رکھا تھا، یعنی جن لوگوں کو اسلام قبول کرنے پر کسی قسم کا ناقابلِ برداشت نقصان پہنچے، ان کے نقصان کی تلافی کے لئے حکومت ان کی مالی امداد کرے۔ یہ حکم عہدِ رسالت مآبؐ اور دَورِ صدیقیؓ میں جاری رہا۔ لیکن حضرت عمرؓ نے یہ کہہ کر اسے بند کر دیا کہ اب مسلمانوں کے حالات بہت بہتر ہو گئے ہیں۔ اس لئے اس امداد کی ضرورت نہیں رہی۔

(۵) ارکانِ حج میں رمَل بھی ایک رکن ہے یعنی طواف کے وقت، پہلے تین چکر ذرا تیز چل کر لگائے جاتے ہیں۔ اس کی ابتداء یوں ہوئی کہ رسول اللہ جب مکہ سے مدینہ تشریف لائے تو مخالفین نے مشہور کر دیا کہ وہاں جا کر مسلمان بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ اس پر حضورؐ نے مسلمانوں سے کہا کہ وہ طواف میں ذرا اکڑ کر تیز چلا کریں تاکہ مخالفین دیکھ لیں کہ ہم یہاں آ کر کمزور نہیں ہو گئے۔ اس سے یہ روش حج کا ایک رکن (ضروری معمول) بن گئی۔ لیکن حضرت عمرؓ نے اپنے زمانہ میں کہا کہ اب ہمیں ایسا کرنے کی کیا ضرورت ہے، جب حالات

رہے، نہ وہ مصلحت، نہ وہ مخالفین رہے نہ ان کا خطرہ۔ اب ہمیں معمول کے مطابق طواف کرنا چاہیئے۔

(۶) قرآن کریم نے مسلمانوں کے لئے اہلِ کتاب کی عورتوں سے نکاح اور ان کے ہاں کا کھانا حلال قرار دیا ہے لیکن حضرت عمرؓ نے ان کی عورتوں سے یہ کہہ کر نکاح کو ممنوع قرار دے دیا کہ یہ عورتیں مسلمانوں کے معاشرہ میں فتنہ کا باعث بن جاتی ہیں۔ اور مسلمانوں کی بستیوں سے یہود و نصاریٰ کے ذبیحہ خانے یہ کہہ کر بند کرا دیئے کہ اب ہمیں ان کی ضرورت نہیں رہی۔

(۷) حضرت عمرؓ نے امِ ولد (یعنی وہ لونڈی جس کے مالک سے اسے اولاد ہوگئی ہو) کی بیع ممنوع قرار دیدی حالانکہ رسول اللہ اور حضرت ابوبکرؓ کے زمانے میں اس کی ممانعت نہیں تھی۔ (واضح رہے کہ یہ حکم ان لونڈیوں کے متعلق تھا جو اسلام سے پہلے والوں کے معاشرہ میں موجود تھیں۔ "غلام اور لونڈیوں" کے متعلق تفصیلی بحث پچھلے باب میں آچکی ہے)۔

(۸) اس سلسلہ کی سب سے اہم مثالیں دو (اور) ہیں۔ ایک عراق کی زمینوں کے متعلق فیصلہ۔ اس اہم واقعہ کی تفصیل تو ہم "معاشی نظام" سے متعلق باب میں بیان کریں گے، اس وقت صرف اتنا کہہ دینا کافی ہوگا کہ (جیسا کہ اس سے پہلے بھی صفحہ لکھا جا چکا ہے) رسول اللہ اور خلافتِ صدیقیؓ میں قانون یہ تھا کہ مالِ غنیمت مجاہدین میں تقسیم کر دیا جاتا تھا۔ فتح عراق کے وقت، مالِ غنیمت میں کثیر مزروعہ زمینیں بھی ملیں۔ سابقہ قاعدہ کے مطابق، مطالبہ ہوا کہ انہیں بھی سپاہیوں میں تقسیم کر دیا جائے لیکن حضرت عمرؓ نے اس سے اختلاف کیا اور کہا کہ ان زمینوں کی پیداوار پہ ساری امت اور آنے والی نسلوں کی پرورش کا دارومدار ہے اس لئے انہیں انفرادی ملکیت میں نہیں دیا جا سکتا۔ یہ مملکت کی تحویل میں رہیں گی۔ کافی بحث و تمحیص کے بعد فیصلہ حضرت عمرؓ کا برقرار رہا۔ یہ سابقہ معمول سے بڑا اہم اختلاف تھا۔

دوسری مثال، افرادِ امت کے وظائف کے تعین کا معیار تھا۔ رسول اللہ اور حضرت صدیق اکبرؓ کے زمانے میں اس کا معیار، ہر فرد یا خاندان کی معاشی ضرورت تھا۔ حضرت عمرؓ نے اس قانون کو بدل دیا اور اسلام کی خدمت کے لحاظ سے مدارج مقرر کر کے انہیں وظائف کا معیار قرار دے دیا۔ یہ اختلاف بھی بہت اہم تھا جس کی تفصیل "معاشی نظام" میں پیش کی جائے گی۔ وہیں یہ بھی بتایا جائے گا کہ ہماری قرآنی بصیرت کے مطابق یہ حضرت عمرؓ کا اجتہادی سہو تھا جس کا بعد میں انہیں خود بھی احساس ہو گیا لیکن قبل اس کے کہ وہ اس کا ازالہ کرتے، ان کی شہادت ہو گئی۔

یہ ان امور کی چند ایک مثالیں ہیں جن میں حضرت عمرؓ نے عہدِ رسالتمآبؐ اور دورِ صدیقیؓ کے فیصلوں سے اختلاف کیا۔ ان کے علاوہ، جو نئے امور سامنے آئے ان کے متعلق آپ نے (پہلی بار) اپنے فیصلے صادر فرمائے۔ انہیں حضرت عمرؓ کی "اوّلیات" کہا جاتا ہے اور ان کی فہرست طویل ہے۔ ظاہر ہے کہ جب مملکت کی وسعت اس قدر بڑھ گئی تھی اور نئے نئے امور نہایت تیزی سے سامنے آ رہے تھے، تو مملکت کے لئے ضروری تھا کہ ان کے تصفیہ کے لئے ضروری احکام نافذ اور قواعد و ضوابط منضبط کرے۔ ان میں سے چند ایک (مثلاً) درج ذیل کئے جاتے ہیں:-

اوّلیات حضرت عمرؓ

(۱) خزانہ قائم کیا۔ (۲) سن ہجری رائج کیا۔ (۳) دفاتر قائم کئے۔ اور رجسٹر مرتب کرائے۔ (۴) مردم شماری کرائی۔ (۵) شہر آباد کرائے۔ نہریں کھدوائیں۔ (۶) عشورہ (یعنی محصول چنگی) کی ابتدا کی۔ (۷) دریائی پیداوار اور گھوڑوں پر زکوٰۃ (حکومت کا ٹیکس) عائد کیا۔ (۸) نماز تراویح جماعت سے قائم کی۔ (۹) نماز فجر کی اذان میں اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ کا اضافہ کیا۔ (۱۰) مساجد میں روشنی کا انتظام کرایا۔ وغیرہ ذالک۔

حاصلِ بحث

ان تفصیلات سے آپ نے دیکھ لیا ہوگا کہ اسلامی نظام میں :-

(۱) قانون کا سرچشمہ قرآن کریم ہے۔ اس کے احکام، اصول اور اقدار سب غیر متبدل ہیں۔ ان میں کسی قسم کے تغیر و تبدل کا کسی کو حق حاصل نہیں۔

(۲) جن امور کو قرآن نے جائز قرار دیا ہے، اگر اسلامی نظام چاہے تو (بتقاضائے حالات) انہیں وقتی طور پر ممنوع قرار دے سکتا ہے۔ یاد رہے کہ اسلامی نظام انہیں ابدا حرام قرار نہیں دے سکتا۔ مصالح امت کے مطابق ان پر وقتی پابندی عائد کر سکتا ہے۔ نہ ہی وہ کسی حرام کو حلال قرار دے سکتا ہے۔

(۳) جن احکام کو قرآن نے مطلق (بلا شرائط و قیود) بیان کیا ہے، اسلامی نظام ان پر عندالضرورت قیود اور شرائط عائد کر سکتا ہے۔ اور بعض احکام کو وقتی طور پر ساقط العمل بھی قرار دے سکتا ہے۔

(۴) سابقہ ادوار کے فیصلوں میں، خواہ وہ رسول اللہ کے زمانے میں ہی کیوں نہ صادر ہوئے ہوں ارد و بدل کر سکتا ہے۔ اور بعض فیصلوں کو منسوخ بھی کر سکتا ہے۔

(۵) نئے پیش آمدہ معاملات کے متعلق نئے احکام بھی صادر کر سکتا ہے۔

یہ ہے اسلامی حکومت میں قانون سازی کا اصول۔ اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ احکام و قوانین میں کسی قسم کا ردّ و بدل، یا حک و اضافہ، صرف اسلامی نظام حکومت کر سکتا ہے۔ کسی فرد یا کسی جماعت کو اس کا حق حاصل نہیں ہو سکتا۔ اس باب میں حضورؐ کا یہ ارشاد گرامی واضح ہے کہ

رسول اللہ نے فرمایا کہ فیصلہ کرنے کا حق امیر کو حاصل ہے یا اسے جسے امیر اس مقصد کے لئے مقرر کرے۔

حضرت عمرؓ نے اس کی تشریح میں فرمایا تھا کہ :-

یہ کام اس کے لئے رہنے دینا چاہئے جو اس کے نفع و ضرر کا ذمہ دار قرار پا سکتا ہے۔

یہ تھا اسلامی نظام میں قانون سازی کا اصول لیکن جب (بعد میں) مسلمانوں کی گاڑی دوسری پٹڑی پر جا پڑی تو پھر یہ تمام اصول بدل گئے۔ اس وقت، نہ اسلامی نظام حکومت باقی رہا، نہ اس کا مرکز۔ دین اور سیاست میں ثنویت پیدا ہو گئی۔

پاکستان میں

امور سیاست حکومت نے . . . . اپنی تحویل میں لے لئے . . . . اور مذہبی امور علماء کے سپرد کر دیئے۔ "مذہبی امور" سے مراد تھی عقائد کی بحث اور پرسنل لاز (شخصی قوانین)۔ بالفاظ دیگر، اُس وقت، اسلام (دین کے بجائے) مذہب بن کر رہ گیا اور مسلمانوں کی حکومت سیکولر ہو گئی۔ مملکت کے معاملات میں فرماں رواؤں نے اپنی من مانی

کی، اور مذہبی امور میں علماء اور فقہاء نے اپنا حکم چلایا۔ امت کے مرکز (اسلامی نظام) کے خاتمے کا لازمی نتیجہ تھا کہ امت میں فرقے پیدا ہو جاتے — فرقے، جن کے وجود کو قرآن نے شرک قرار دیا ہے۔ (۳۲/۳۰) چنانچہ فرقے پیدا ہوئے اور ہر فرقے نے اپنے اپنے مسلک کے مطابق فتوے دینے شروع کر دیئے۔ یہ سلسلہ صدیوں سے چلا آ رہا ہے۔

تشکیلِ پاکستان کا بنیادی مقصد یہ تھا کہ یہاں پھر سے صدرِ اوّل کے اسلامی نظام کا احیاء کیا جائے۔ اس سلسلہ میں سب سے پہلا سوال قانون سازی کا تھا۔ جب یہ بحث چھڑی تو اسلامی نظام کا تصور کسی کے سامنے نہیں تھا۔ اس لئے ہر فرقہ نے اپنی اپنی بات کہنی شروع کر دی۔

(۱) ایک فرقہ نے کہا کہ جو کچھ کتب احادیث میں درج ہے، اسلامی حکومت کو اس کا حق نہیں پہنچتا کہ اس میں سے کسی حکم کو معطل یا منسوخ کر دینا تو درکنار، اس میں کسی قسم کا ردّ و بدل بھی کر سکے۔ ایسا کرنا انکارِ سنت ہوگا۔ نیز اسلامی حکومت کو اس کا حق بھی حاصل نہیں کہ وہ کوئی نیا حکم نافذ کر سکے۔ یہ بدعت ہوگی جس کی دین میں قطعاً اجازت نہیں۔

(۲) دوسرے فرقے نے کہا کہ جو کچھ ہمارے ائمہ فقہ نے فیصلہ کر دیا ہے، اسلامی حکومت کے لئے ضروری ہے کہ وہ من و عن ان فیصلوں کو نافذ کرے۔ ان میں کسی قسم کے تغیّر و تبدل کا اُسے حق حاصل نہیں۔

جدید امور کے متعلق ان میں سے بعض لوگ اتنی اجازت دیتے ہیں کہ اسلامی حکومت، فقہاء کے فیصلوں کی روشنی میں نئے احکام نافذ کر سکتی ہے۔ لیکن دوسرے حضرات اس کی بھی اجازت نہیں دیتے وہ کہتے ہیں کہ اب اجتہاد کا دروازہ یکسر بند ہے۔

(۳) جہاں تک قرآنی احکام کا تعلق ہے، اہلِ حدیث کا عقیدہ ہے کہ رسول اللہؐ کی حدیث، قرآنی حکم کو منسوخ کر سکتی ہے[1]۔ اور اہلِ فقہ کا عقیدہ کہ اگر قرآن کی کوئی آیت، ان کے ائمہ کے کسی فیصلہ کے خلاف ہو تو اوّل تو اس آیت کی ایسی تاویل کرنی چاہئے جو ائمہ کے فیصلہ کے مطابق ہو۔ اور اگر ایسا نہ ہو سکتا ہو تو قرآن کی آیت کو منسوخ سمجھنا چاہئے۔ (تاریخ فقہ اسلامی - علامہ خضری ص ۱۲۱)۔

(ان امور پر تفصیلی بحث آخری باب میں ہوگی)۔

اس وقت ہمارے علماء کرام کا یہی مسلک ہے اور تعجب ہے کہ اہلِ حدیث حضرات ہوں یا اہلِ فقہ، حضرت عمرؓ کو مومن حقا اور خلیفۂ راشد تسلیم کرتے ہیں، اور انکے عہدِ خلافت کو اسلامی حکومت کا بہترین آئینہ دار قرار دیتے ہیں۔

ان حضرات کا جو مسلک اوپر بیان کیا گیا ہے اور جس کے متعلق انہیں اصرار ہے کہ وہ عین اسلام ہے ظاہر ہے کہ اس کی رُو سے قانون سازی کے سلسلہ میں کوئی حکومت بھی دورِ حاضر کے تقاضوں کو پورا

---

[1] مثلاً قرآن کی آیت متعلقہ وصیّت کو ایک حدیث نے منسوخ کر دیا ہے۔ (ملاحظہ ہو "فتنہ انکارِ حدیث" از علامہ محمد ایوب مرحوم صفحہ ۸۵)۔

نہیں کرسکتی۔ لیکن چونکہ (اس پچیس سال[1] میں) کسی حکومت میں اس کی جرأت نہیں تھی کہ وہ عہدِ فاروقی کی نظیر پیش کرکے، قانون سازی کے لئے صحیح اسلامی طریق اختیار کرے اور اس طرح علماء حضرات سے جھگڑا مول لے، اس لئے انہوں نے اسی میں مصلحت سمجھی کہ آئین میں تو یہ الفاظ درج کر دیئے جائیں کہ "پاکستان میں کوئی قانون کتاب و سنت کے خلاف نہیں ہوگا۔ لیکن عملاً وہی کچھ ہونے دیا جائے جو ہو رہا ہے۔ لہٰذا، ہم آج بھی اسی مقام پر کھڑے ہیں جہاں انگریز کے عہدِ حکومت میں تھے۔ (اس سلسلہ میں راقم الحروف اپنے اقدامات کا تذکرہ کرنے کے لئے قارئین سے معذرت خواہ ہے)۔

میں نے جرأت کی اور کہا کہ قانون سازی کے لئے ہمارے سامنے عہدِ فاروقی بہترین نمونہ ہے۔ ہمیں ان اصولوں کے مطابق ضابطۂ قوانین مرتب کر لینا چاہیئے۔ علماء حضرات نے اسے "انکارِ سنت" قرار دے کر کفر کا فتویٰ صادر کر دیا۔ اور اس کے بعد مطمئن ہو کر بیٹھ گئے ـــــ اسلامی ضابطۂ قوانین نہ بننا تھا، نہ بنا، نہ بن سکے گا۔ اس کا اعتراف خود ان حضرات نے بھی کر لیا ہے کہ کتاب و سنت کی رُو سے کوئی ایسا ضابطۂ قوانین مرتب نہیں ہو سکتا جو تمام فرقوں کے نزدیک قابلِ قبول ہو[2]۔ یہ اعتراف بھی ہے، اور اس پر اصرار بھی کہ ضابطۂ قوانین "کتاب و سنت" کے مطابق مرتب ہونا چاہیئے۔ یا للعجب!

یاد رکھئے! وہی اسلامی حکومت، اسلامی ضابطۂ قوانین مرتب کر سکے گی جو خلافتِ فاروقی کو اپنے لئے اسوۂ (نمونہ) قرار دے کر وہ عہد، عہدِ رسالت مآبؐ اور عہدِ صدیقیؓ دونوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔

لیکن ایسا وہی کر سکے گا جو صرف خدا کے احکام کی خلاف ورزی سے ڈرے، علماء حضرات کے کفر کے فتووں سے نہ ڈرے۔ اس مقام پر ہم ایک بار پھر اقبالؒ کے الفاظ دہرا دینا چاہتے ہیں کہ

"ایسا وہی حکومت کر سکے گی جو روحِ عمرؓ کو لے کر آگے بڑھے"

معلوم نہیں اس کی سعادت کس ملک کے حصے میں آئے گی!

آوازۂ حق اُٹھتا ہے کب، اور کدھر سے   مسکیں دلکم ماندہ دریں کش مکش اندر

ـــــــ (۰) ـــــــ

(۳) قانون سازی ہی نہیں ـــ سیرت سازی بھی

حضرت عمرؓ اس حقیقت سے بھی باخبر تھے کہ قانون خواہ کیسا ہی مکمل، جامع، اور اسقام سے منزہ کیوں نہ

---

[1] یہ کتاب ۱۹۵۵ء میں شائع ہوئی تھی۔

[2] "اگر مسلمانوں کی ایک متحدہ اسلامی ریاست قائم ہونے کے لئے یہ شرط قرار دے دی جائے کہ ملک میں جتنے مختلف مسلکوں کے مسلمان موجود ہیں وہ سب کسی ایک مسلک پر متفق ہو جائیں تو یہ شرط نہ کبھی پوری ہوگی نہ اس شرط کے ساتھ دُنیا میں کوئی اسلامی ریاست قائم ہو سکے گی ..... "کتاب و سنت" کی کوئی ایسی تعبیر ممکن نہیں جو پبلک لاء کے معاملے میں حنفیوں، شیعوں اور اہلِ حدیث کے درمیان متفق علیہ ہو۔ (ابوالاعلیٰ مودودی صاحب۔ بحوالہ ایشیا۔ ۲۴ اگست ۱۹۷۰ء)

ہو، وہ کبھی صحیح نتائج پیدا نہیں کر سکتا جب تک اس قانون کو نافذ کرنے والوں کی سیرت صحیح سانچوں میں منڈھلی ہو۔ بنا بریں، وہ قانون سازی کے ساتھ ساتھ، ان انسانوں کی سیرت و کردار پر بھی کڑی نگاہ رکھتے تھے جنہوں نے ان قوانین کو عملاً نافذ کرنا تھا۔ اس میں شک نہیں کہ آپ کے رفقاء کا گروہ بھی ان مہاجرین و انصار پر مشتمل تھا جن کے مومنین حقاً ہونے کی شہادت خود قرآن نے دی تھی (۸/۷۴) لیکن مومنین کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ وہ "کبائر الاثم" (بڑے بڑے عیوب و جرائم) سے مجتنب رہتے ہیں۔ البتہ معمولی لغزشوں (لمم) کا ان سے امکان ہو سکتا ہے (۵۳/۳۲) اس قسم کی معمولی لغزشیں، عام لوگوں کی صورت میں کوئی خاص مضر اثر پیدا نہیں کرتیں (کیونکہ ان کے اعمال و افعال کا اثر متعدی نہیں ہوتا) لیکن جن ارباب نظم و نسق کے ہاتھ میں لاکھوں (کروڑوں) انسانوں کا حال اور مستقبل ہو اور ان کی قیادت کی اہم ذمہ داری جن کے کندھوں پر، ان کے لئے اس قسم کی عام لغزشوں سے بچنا بھی نہایت ضروری ہوتا ہے۔ یہ وجہ تھی جو حضرت عمرؓ اپنے ان جلیل القدر رفقاء کی ہر نقل و حرکت پر نگاہ رکھتے تھے ——— سب سے پہلے، خود اپنے آپ پر، اور اس کے بعد ان عمالِ حکومت پر۔ صدرِ اوّل کے اسلامی نظام نے جو اس قدر ابد درکنار درخشندہ و تابندہ و تابناک، انسانیت ساز، نتائج پیدا کئے تھے تو اس کی وجہ، قوانینِ حکومت کے مبنی بر حق ہونے کے علاوہ، اعیان و ارکانِ حکومت کی پاکیزگیٔ سیرت اور بلندیٔ کردار بھی تھی اور یہی وجہ تھی جو حضرت عمرؓ ان کے انتخاب میں بڑی احتیاط برتتے تھے۔

عمالِ حکومت کے انتخاب کا معیار

قرآن کریم چونکہ اس نظام کا نقطۂ پرکار تھا، اس لئے عمال کے انتخاب میں، قرآنی علم کو بنیادی خصوصیت قرار دیا جاتا تھا۔ (جیسا کہ پہلے بھی لکھا جا چکا ہے) مکہ کے گورنر، نافع بن عمر بن عبد الحارث آپ سے ملے تو آپ نے پوچھا کہ تم نے اہلِ وادی پر کسے حاکم مقرر کیا ہے۔ انہوں نے کہا کہ عبد الرحمٰن بن ابزی کو۔ آپ نے پوچھا کہ وہ کون ہے۔ انہوں نے کہا کہ وہ (سابقہ) غلاموں میں سے ایک غلام ہے۔ پوچھا کہ اُسے کس خصوصیت کی بنا پر حاکم مقرر کیا ہے۔ تو انہوں نے جواب میں کہا کہ اس کی قرآن پر گہری نگاہ ہے اور فرائض دین کا علم حاصل ہے۔ اس پر آپ خوش ہوئے۔

(۲) اس واقعہ کو پھر سے سامنے لائیے جس میں ایک شخص نے کہا تھا کہ فلاں آدمی بڑا قابلِ اعتماد ہے تو آپ نے پوچھا تھا کہ کیا تم کبھی اس کے پڑوس میں رہے ہو؟ کیا تم نے کبھی اس کے ساتھ سفر کیا ہے؟ یا کیا تم نے اس کے ساتھ کوئی معاملہ کیا ہے؟ اور جب اس نے ان سوالات کا جواب نفی میں دیا تھا تو آپ نے کہا تھا کہ پھر تمہیں اس شخص کے متعلق کچھ بھی معلوم نہیں۔ تم نے اسے مسجد میں اُٹھتے بیٹھتے (نماز پڑھتے) دیکھ لیا اور یہ رائے قائم کر لی کہ وہ بڑا قابلِ اعتماد ہے۔

حسنِ معاملات

یہی معیار آپ عمالِ حکومت کے انتخاب کے سلسلہ میں اختیار فرماتے تھے۔ وہ کسی کے نماز روزے کو نہیں دیکھتے تھے بلکہ منصبِ متعلقہ کے لئے اس کی صلاحیت اور حسنِ معاملات کو دیکھتے تھے۔ اور ان صلاحیتوں میں جو بھی سب سے آگے

ہوتا اسے منتخب کرتے تھے، اور اس باب میں کسی کی رُو رعایت نہیں کرتے تھے۔ آپ اکثر کہا کرتے تھے کہ میں کبھی پسند نہیں کرتا کہ کسی ایسے شخص کو گورنر مقرر کروں جس سے اعلیٰ صلاحیتوں کا حامل کوئی دوسرا شخص موجود ہو

(۳) انتخاب کے لئے آپ کے اصولوں میں سے ایک اصول ملاحظہ فرمائیے اور پھر آپ خود ہی اندازہ

ایک بلند اصُول

لگائیے کہ آپ جس شخص کو منتخب کرتے تھے وہ کس سیرت وکردار کا حامل ہوتا تھا۔ آپ فرمایا کرتے تھے کہ میں سیادت (اعلیٰ منصب) کے لئے ایسے شخص کو منتخب کرنا پسند کرتا ہوں کہ

جب وہ اس منصب پر فائز نہ ہو تو اپنی قوم کا سردار نظر آئے۔ اور جب اُسے قوم کا سردار بنا دیا جائے تو وہ انہی میں کا ایک فرد معلوم ہو۔

سوچئے! اس معیار کو دیکھ کر آپ کی نگہ بصیرت وجد میں آگئی ہے یا نہیں!

(۴) آپ یہ بھی فرمایا کرتے تھے کہ

خدا خائن کی قوت اور ثقہ انسان کے عجز (کمزوری) سے بچائے۔

ثقاہت اور قوت

یعنی قوتوں اور صلاحیتوں کا مالک انسان اگر خائن ہے تو وہ بھی خطرناک ہے۔ اور ایک شخص نہایت دیانت دار اور قابلِ اعتماد ہے لیکن ہے کمزور تو وہ بھی مضرت رساں ہے۔ لہٰذا، انتخاب کا اصول تھا۔ ثقاہت اور قوت۔

(۵) لیکن "قوت" سے مراد سنگدلی اور شقاوتِ قلبی نہیں تھی۔ عدل کے لئے جرأت و بسالت تھی۔ آپ نے ایک دفعہ ایک شخص کو گورنری کے لئے منتخب کیا۔ اس کی تعیناتی کا پروانہ لکھا رہے تھے کہ ایک بچہ آیا۔ آپ کی گود میں بیٹھ گیا اور آپ نے اسے پیار کیا۔ اس (منتخب شدہ شخص) نے کہا کہ امیر المومنین! میرے دس بچے ہیں مگر کوئی میرے پاس نہیں پھٹک سکتا۔

شفقت اور محبت

آپ نے کہا کہ اس میں میرا کیا قصور؟ اگر خدا نے تیرے دل سے رحم نکال لیا ہے تو میں کیا کروں؟ اُس سے یہ کہا اور کاتب سے کہا کہ دستاویز پھاڑ دو۔ جو شخص اپنی اولاد کے ساتھ شفقت اور محبت سے پیش نہیں آتا وہ رعایا پر کیسے رحم کرے گا۔

(۶) کسی صوبے کی گورنری کے لئے ایک شخص آپ کے ذہن میں تھا لیکن اس نے ایک دن

طلب گار کو نہیں

آکر آپ سے کہا کہ مجھے گورنر تعینات کر دیجئے۔ آپ نے فرمایا کہ میں تجھے ہی گورنر بنانے والا تھا، لیکن اب نہیں بناؤں گا کیونکہ جو شخص خود کسی عہدہ کا خواہش مند ہو، اُسے اس عہدہ پر فائز نہیں کرنا چاہئے۔

(۷) آپ نے نعمان بن عدی کو ایک صوبہ کا گورنر مقرر کیا۔ کچھ عرصہ کے بعد اس کے کچھ اشعار آپ

شاعرانہ غلو

کے سامنے آئے جن میں اس نے شاہد و شراب کی وجد آور کیفیات بیان کی تھیں آپ نے اُسے بلا کر پوچھا تو اس نے کہا کہ امیر المومنین! بخدا میں نے آج تک کبھی

شراب کو چکھا تک نہیں۔ یہ تو محض شاعری ہے۔ آپ نے کہا کہ یہ ٹھیک ہے میں بھی ایسا ہی سمجھتا ہوں تو شاعر تو بہت اچھا ہے لیکن گورنری کے قابل نہیں۔ اس لئے تجھے معزول کیا جاتا ہے۔ (یہ حضرت عمرؓ کے اپنے قبیلے کا آدمی تھا)۔

(۸) صحابہؓ میں سے جو لوگ زیادہ صاحب اثر تھے آپ انہیں اپنے پاس رکھتے تھے۔ مدینہ سے باہر

اشخاص پرستی کے خلاف

نہیں جانے دیا کرتے تھے۔ ایک دفعہ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے پوچھا کہ آپ ہم لوگوں کو باہر کیوں نہیں جانے دیتے؟ آپ نے فرمایا کہ "اس سوال کا جواب نہ دینا، جواب دینے سے بہتر ہے۔"

اور وجہ ظاہر ہے کہ یہ حضرات باہر جاتے تو نو مسلموں میں شخصیت پرستی شروع ہو جاتی۔

(۹) اہلِ کوفہ کی طرف سے آپ ہمیشہ پریشان رہتے تھے۔ اگر وہاں کسی نرم مزاج آدمی کو گورنر بنا کر

اپنے بیٹے کو گورنر نہیں بنایا

بھیجا جاتا تو وہ اسے خاطر میں نہ لاتے۔ اگر وہ سخت مزاج ہوتا تو اس کی شکایتیں کرتے۔ ایک مرتبہ آپ نے تنگ آکر کہا کہ اگر مجھے کوئی ایسا آدمی مل جائے جو نہایت قوی بھی ہو اور امین بھی تو میں اسے وہاں کا گورنر مقرر کر دوں۔ ایک شخص پاس بیٹھا تھا۔ اس نے کہا کہ میں آپ کو ایسا آدمی بتاتا ہوں۔ آپ نے پوچھا کہ وہ کون ہے۔ اس نے کہا کہ عبداللہ ابن عمرؓ (یعنی خود آپ کے صاحب زادہ)۔

یہ سن کر آپ نے فرمایا کہ "خدا تجھے غارت کرے!" (اس سے زیادہ اور کیا کہوں!)۔

اس قدر احتیاط کے بعد، آپ عمالِ حکومت کا تقرر کرتے لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ کسی شخص کے تقرر کے بعد آپ اس کی طرف سے مطمئن ہو کر بیٹھ جاتے۔ آپ ان میں سے ہر ایک پر کڑی نگاہ رکھتے (اس کی تفصیل چند سطور آگے چل کر ملے گی) اور کسی کے متعلق کوئی شکایت ملتے تو اُسے وہاں سے تبدیل کر دیتے۔

تبادلے

اور شکایت کے درست ثابت ہونے پر اُسے معزول کر دیتے۔ آپ کا مقولہ تھا کہ:

"اگر کوئی حاکم کسی جگہ کوئی زیادتی کرتا ہے اور میں اُسے، اس کا علم ہو جانے کے بعد بھی وہاں سے تبدیل نہیں کرتا تو یہ سمجھئے کہ وہ ظلم و زیادتی گویا خود میں نے کی ہے۔"

فرمایا:-

کیا تم لوگوں کا خیال ہے کہ اگر میں کسی ایسے شخص کو گورنر تعینات کر دوں جو میرے خیال میں تم سب سے بہتر ہو۔ پھر اُسے انصاف کرنے کی تاکید بھی کر دوں، تو کیا میں اپنی ذمہ داری سے عہدہ برآ ہو جاؤں گا؟"

لوگوں نے کہا کہ ہاں!

آپ نے فرمایا!-

نہیں! جب تک میں یہ نہ دیکھ لوں کہ وہ میری ہدایات کے مطابق کام بھی کر رہا ہے یا نہیں میں

اس وقت تک اپنی ذمہ داری سے سبکدوش نہیں ہو سکتا۔"

—— (۲) ——

(۴) ہدایات

عمال کی تعیناتی کے وقت، اور اس کے بعد بھی، وقتاً فوقتاً آپ جو ہدایات دیتے اور نافذ کرتے رہتے تھے ان سے اندازہ ہو سکتا ہے کہ آپ انہیں کس سیرت و کردار کا حامل، اور امور مملکت کو کن خطوط پر سرانجام پاتے دیکھنا چاہتے تھے۔ (مثلاً)

(۱) آپ جب کسی کو گورنر بنا کر بھیجتے تو فرماتے:-

یاد رکھو! میں تم لوگوں کو مستبد اور ظالم بنا کر نہیں بھیج رہا۔ بلکہ رعایا کا راہ نما (امام) بنا کر بھیج رہا ہوں کبھی کسی بے قصور کو نہ مارنا کہ وہ ذلیل ہو جائے اور کبھی کسی کی بے جا تعریف نہ کرنا کہ وہ بھیل جائے۔ لوگوں کے کاموں میں رکاوٹ پیدا کرنے کے بجائے سہولتیں مہیا کرنا۔

(۲) آپ نے حضرت ابو موسیٰ اشعری کو لکھا:-

اپنی مجالس میں لوگوں کو مساوی درجہ دو تاکہ کمزور آدمی تمہارے عدل سے ناامید نہ ہو جائے اور صاحب منصب اس سے ناجائز فائدہ نہ اٹھا سکیں۔

(۳) جب کسی حاکم کے متعلق سُنتے کہ وہ مریضوں کی عیادت کے لئے نہیں جاتا اور صاحب احتیاج اس کے پاس آنے سے گھبراتے ہیں تو آپ اُسے برخاست کر دیتے۔

(۴) حضرت ابو عبیدہ بن جراح رض کے نام ایک خط میں لکھا:-

یاد رکھو! لوگوں کے معاملات وہی سنوار سکتے ہیں جن کا عزم راسخ ہو اور وہ کسی سے دھوکا نہ کھائیں۔

نہ دھوکا دیتا ہے نہ دھوکا کھاتا ہے

ضمناً، ایک دفعہ ایک شخص نے کہا کہ مومن کسی کو دھوکا نہیں دیتا۔ آپ نے فرمایا کہ بات مکمل کرو۔ مومن نہ کسی کو دھوکا دیتا ہے، نہ دھوکا کھاتا ہے۔

(۵) ہر عامل سے عہد لیا جاتا تھا کہ وہ (۱) ترکی گھوڑے پر سوار نہیں ہوگا (کہ اس میں رعونت اور نخوت پائی جاتی ہے) (۲) باریک کپڑے نہیں پہنے گا۔ (۳) چھنا ہوا آٹا نہیں کھائے گا۔ (۴) اپنے دروازے پر دربان نہیں بٹھائے گا۔ (۵) اہل حاجت کے لئے اپنا دروازہ کھلا رکھے گا۔ یہ شرائط تقرری کے پروانے میں درج کر دی جاتی تھیں اور انہیں مجمع عام میں پڑھ کر بھی سُنا دیا جاتا۔

(۶) آپ نے ایک دفعہ اپنے عمال کو مخاطب کرتے ہوئے کہا:-

یاد رکھو! رعیت اس وقت تک امام کی پیروی کرتی ہے جب تک وہ اللہ کی اطاعت کرتا ہے جب

وہ احکامِ خداوندی سے سرکشی برتتا ہے تو رعایا اس کے احکام سے سرکشی اختیار کر لیتی ہے۔ جب وہ فسق و فجور اختیار کر لیتا ہے تو رعایا اس سے بڑھ کر فاسق و فاجر ہو جاتی ہے۔

(۷) ایک دفعہ ایک شخص نے آپ کی اور حضرت عثمانؓ کی دعوت کی۔ جب وہاں سے واپس آئے تو آپ نے حضرت عثمانؓ سے کہا کہ کاش! میں یہ دعوت قبول نہ کرتا۔ انہوں نے پوچھا کہ کیوں؟ فرمایا: "مجھے ڈر ہے کہ کہیں یہ دعوت اس لئے نہ کی گئی ہو کہ وہ لوگوں سے یہ کہے کہ دیکھو! میں کتنا بڑا آدمی ہوں جس کے گھر اتنے اتنے بڑے لوگ کھانے کے لئے آتے ہیں"۔ اسی بنا پر وہ عمالِ حکومت کو بھی دعوتیں قبول کرنے سے روکا کرتے تھے۔

(۸) حضرت سعد بن ابی وقاصؓ کو ایک مراسلہ میں لکھتے ہیں کہ مجھے اطلاع ملی ہے کہ کسی جھگڑے میں

عصبیتِ جاہلیہ کے خلاف

قبیلہ ضبہ نے اپنے امیر کی طرف رجوع کرنے کے بجائے، آلِ ضبہ (اپنے قبیلہ) کو مدد کے لئے پکارا تھا۔ یاد رکھو! جب کوئی شخص اپنے قبیلے کو آواز دے تو سمجھ لو کہ وہ شیطان کی آواز ہے۔ اس سے عہدِ جاہلیت کی قبائلی عصبیت جسے مٹانے کے لئے اسلام آیا تھا، پھر سے بیدار ہو جائے گی۔ اس رجحان کو سختی سے روکو۔ اب اگر وہ دو ہی ہوں گے ظالم (زیادتی کرنے والا) اور مظلوم۔ اور مظلوم صرف امیر کو مدد کے لئے پکارے۔

(۹) حضرت عمرو بن عاصؓ کو ایک خط میں لکھا ___ اور غور سے سنئے کہ کیا لکھا ___ لکھا کہ

تم اپنی رعایا کے لئے ایسے بن جاؤ جیسے تم اگر رعایا ہو تو چاہو کہ تمہارا امیر ایسا ہو۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم مجلس میں تکیہ لگا کر بیٹھتے ہو۔ ایسا ہرگز نہ کرو۔ عام لوگوں کی طرح بیٹھا کرو۔

(۱۰) آپ نے سپہ سالاروں کو ہدایت دے رکھی تھی کہ جنگ کے دوران کسی کو سزا نہ دو، مبادا وہ دشمن کے ساتھ جا ملے۔

(۱۱) حضرت ابو موسیٰ اشعریؓ کو (جب وہ بصرہ کے گورنر تھے) لکھا کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ تم عوام کے ہجوم کو ایک ساتھ بلا لیتے ہو۔ مساوات بے شک اپنی جگہ ہے لیکن اہلِ علم و دیانت کی قدر افزائی بھی ضروری ہے۔ اس لئے قرآن دان اور صاحبِ دیانت لوگوں کو پہلے بلایا کرو۔ (ایسا کرنا علاوہ ان حضرات کی قدر افزائی کے، دوسروں کے دل میں قرآن دانی اور دیانت کا شوق پیدا کرے گا۔)

(۱۲) ایک اور قول سنئے اور جھوم جائیے۔ فرمایا:-

نرمی بلا ضعف۔ سختی بلا جبر

وہی حکومت درست رہ سکتی ہے جس میں نرمی ہو لیکن کمزوری کی وجہ سے نہیں، اور جس میں سختی ہو، لیکن استبداد کی بنا پر نہیں ___ بلا ضعف نرمی، اور بلا جبر قوت ___ یہ ہے اصل الاصول۔

(۱۳) حضرت مغیرہؓ کو کوفہ کا گورنر بنایا تو کہا کہ

مغیرہؓ! ایسا بن کر رہنا کہ نیک لوگ تجھ سے بے خوف رہیں، اور بدمعاش خوف زدہ۔

(۱۴) ایک اور وجد آفریں قول ___ فرماتے ہیں:-

وجد آفریں قول

جو شر پیدا کر کے غالب آیا، وہ غالب نہیں مغلوب ہے۔
جس نے ناجائز طریق سے کامیابی حاصل کی، وہ کامیاب نہیں، ناکام ہے۔

ایک دفعہ حضرت عمیر بن سعدؓ نے دمشق میں منبر پر کھڑے ہو کر لوگوں سے کہا کہ

جب تک اسلام میں حکومت کا زور ہے وہ ناقابل شکست رہے گا۔ لیکن حکومت کے زور کا مطلب تلوار سے قتل کرنا اور تازیانے مارنا نہیں بلکہ حق کے ساتھ فیصلہ اور انصاف کے ساتھ مؤاخذہ کرنا ہے۔

حضرت عمرؓ نے سنا تو فرمایا، اے کاش! عمیرؓ جیسا آدمی میرے قریب ہوتا تو میں اس سے مسلمانوں کے کتنے کام لیتا۔

(۱۵) ایک دفعہ عراق کا ایک وفد آیا جس میں حضرت احنف بن قیسؓ بھی تھے۔ سخت گرمی کا دن تھا۔ دیکھا کہ حضرت عمرؓ دھوپ میں کھڑے بیت المال کے ایک اونٹ کو تیل مل رہے ہیں اور اپنی قبا کو لپیٹ کر سر پر بطور عمامہ باندھ رکھا ہے۔ وفد کو دیکھا تو فرمایا :

احنفؓ! کپڑے اتار کر آجاؤ اور میری مدد کر۔ یہ بیت المال کا اونٹ ہے جس میں یتیموں، بیواؤں اور مسکینوں کا حق ہے۔

ایک شخص نے کہا۔۔۔ امیرالمومنین! آپ کسی غلام (خادم) سے کیوں نہیں کہتے کہ وہ یہ کام کر دے۔
آپ نے فرمایا کہ مجھ سے اور احنف سے بڑا غلام کون ہوگا۔

اور اس کے بعد وہ انقلاب آفریں فقرہ ارشاد فرمایا جس کے لئے ہم نے اس واقعہ کو نقل کیا ہے۔ کہا :-

غلام کی طرح مخلص اور امین

جو شخص مسلمانوں کا والی بنے اس کے لئے ضروری ہے کہ وہ غلام کی طرح مخلص اور امین رہے۔

(۱۶) عام مکتوب یہ تھی :

کھردرے بنو اور عجمیوں کی طرح نازو انداز نہ کرو۔ اپنے آپ کو ان کے لباس سے بھی بچاؤ، کہ وہ تمہیں آرام طلب بنا دے گا۔ سخت بنو۔ چھوٹا موٹا کھاؤ۔ گاڑھا گزی پہنو۔ پرانے کپڑے استعمال کرو۔ سواریوں کو خوب فربہ کرو۔ ڈٹ کر گھوڑ سواری کرو، اور جم کر تیر اندازی کی مشق کرتے رہو۔ ہمیں تکلف سے منع کیا گیا ہے، اس لئے کبھی تکلف نہ کرو۔ دین میں تفقہ حاصل کرو۔ کتاب کے ظرف اور علم کے سرچشمے بنو۔ سیادت و قیادت حاصل کرنے کی خواہش ہے تو پہلے سمجھ پیدا کرو۔ جس میں تکبر دیکھو سمجھ لو کہ وہ احساس کمتری کا شکار ہے۔

(۱۷) اور آخر میں وہ ہدایت، جس میں تمام ہدایات سمو جاتی ہیں۔ فرمایا :-

محاسبۂ خویش

اپنا محاسبہ آپ کرو قبل اس کے کہ تمہارا محاسبہ کیا جائے۔ کیوں کہ محاسبۂ خویش تمہارے حساب کتاب کو آسان کر دے گا۔

اپنے آپ کا وزن کرتے رہو قبل اس کے کہ تمہارے لئے میزان کھڑی کی جائے۔ اپنے آپ کو "عرض

اکبر (عدالت کی بڑی پیشی) کے لئے تیار رکھو جس دن تمہاری کوئی بات بھی پوشیدہ نہیں رہے گی۔
آیئے — ہم دیکھیں کہ یہ محاسبہ کس طرح ہوا کرتا تھا۔ اپنا بھی اور دوسروں کا بھی۔

---

(۵) اِحتساب

مقبوضات کی فہرست

احتساب کا پہلا قدم یہ تھا کہ ہر عامل کی تقرری کے وقت اس کے مقبوضات کی فہرست مرتب کر لی جاتی، اور اسے وقتاً فوقتاً چیک کرتے رہتے۔ اس کے ساتھ ہی التزام یہ تھا کہ ہر عامل کو اتنا دیا جائے جس سے اس کی اور اس کے متعلقین کی ضروریات باطمینان پوری ہوتی رہیں (تفصیل اس کی معاشی نظام میں ملے گی)۔

(۲) آپ نے احکام جاری کر رکھے تھے کہ کوئی گورنر مدینہ آئے تو دن کے وقت آئے اور لوگوں کے سامنے شہر میں داخل ہو۔ رات کے وقت نہ آئے۔

(۳) یہ احتساب مال تک محدود نہیں تھا۔ عُمّال کے رہن سہن، طرز بود و ماند، تمدن و معاشرت اخلاق عامہ، غرضیکہ ان کی ہر نقل و حرکت پر آپ کی نگاہ رہتی تھی۔ مصر کے گورنر (حضرت) عیاض بن غنمؓ کا واقعہ پہلے گذر چکا ہے۔ ان کے خلاف شکایت یہ تھی کہ وہ باریک کپڑے پہنتے ہیں، اور انہوں نے دربان مقرر کر رکھا ہے۔ شکایت کے صحیح ثابت ہونے پر آپ نے ان سے کہا کہ یہ لو، اُون کا جُبّہ پہنو۔ ایک عصا لو اور بیت المال کی تین سو بکریاں چراؤ تاکہ تمہیں معلوم ہو کہ راعی (گڈریا) کی ذمہ داری کیا ہوتی ہے۔

راعی کی ذمہ داری

حمص کے گورنر (حضرت) عبداللہ بن قرط کے خلاف یہ شکایت تھی کہ انہوں نے اپنے رہنے کے لئے بالاخانہ بنوایا تھا جس کی اجازت نہیں تھی۔ بالاخانہ کو تو آپ (حضرت عمرؓ) نے آگ لگوا دی اور گورنر کو ایک جبّہ پہنوا کر، ہاتھ میں ایک ڈول دیا اور کہا کہ بیت المال کے اونٹوں کو پانی پلایا کرو اس سے، دماغ سے تفاخر کی بُو نکل جائے گی۔

(۴) فاتح مصر حضرت عمرو بن عاصؓ کے بیٹے کا واقعہ پہلے گذر چکا ہے جس نے ایک قبطی کو بلا وجہ پیٹ دیا تھا۔ آپ نے اس قبطی کے ہاتھوں اُسے کوڑے لگوائے تھے۔ اور یہ بھی کہا تھا کہ خود (حضرت) عمرو بن عاصؓ کے بھی ایک آدھ تازیانہ لگا دیا جائے جس نے اپنے بیٹے کی صحیح تربیت نہیں کی۔

(۵) شکایت سُننے پر یونہی اندھا دھند مؤاخذہ نہیں کر لیا جاتا تھا۔ شکایت کی پوری پوری چھان بین کی جاتی اور جس کے خلاف شکایت ہوتی اُسے اپنی مدافعت کا موقعہ دیا جاتا۔ لوگوں نے حمص کے گورنر (حضرت) سعید بن عامرؓ کے خلاف چار شکایتیں کیں۔ (۱) وہ دن چڑھے تک گھر سے نہیں نکلتے۔ (۲) رات کے وقت کسی کی پکار

مدافعت کا موقعہ دیا جاتا

نہیں سُنتے۔ (۳) مہینہ میں ایک دن بالکل باہر نہیں آتے۔ اور (۴) کبھی کبھی ایسا ہوتا ہے جیسے ان پہ سکتہ طاری ہو گیا ہو۔

مقدمہ پیش ہوا تو آپ نے سعید سے پوچھا کہ پہلی شکایت کا تمہارے پاس کیا جواب ہے۔ انہوں نے کہا۔ بخدا مجھے یہ پسند نہ تھا کہ میں اس بات کو عام کروں لیکن آپ پوچھتے ہیں تو مجھے بتانا ہی پڑے گا۔ واقعہ یہ ہے کہ میری بیوی کے پاس کوئی خادمہ نہیں میں نے اس کا کچھ کام اپنے ذمہ لے رکھا ہے۔ صبح اٹھ کر آٹا گوندھتا ہوں اس کے خمیر ہونے تک انتظار کرتا ہوں۔ پھر روٹی پکاتا ہوں۔ ازاں بعد وضو کر کے باہر آتا ہوں۔

دوسری شکایت یہ تھی کہ رات کے وقت باہر نہیں آتے۔ آپ نے جواب میں کہا کہ میں یہ راز بھی سربستہ ہی رکھنا چاہتا تھا۔ لیکن اب اسے بھی کھولنا پڑا۔ میں نے دن رعایا کے لئے اور رات اللہ کے لئے وقف کر رکھا ہے۔

تیسری شکایت یہ ہے کہ میں مہینے میں ایک دن باہر نہیں نکلتا۔ سو میرے پاس خادم نہیں جو میرے کپڑے دھوئے، نہ ہی کپڑوں کا کوئی فالتو جوڑا ہے۔ مہینے میں ایک دن کپڑے دھوتا ہوں اور ان کے خشک ہونے تک انتظار میں بیٹھا رہتا ہوں۔

اب رہا چوتھا الزام کہ مجھ پہ کبھی کبھی سکتہ طاری ہو جاتا ہے۔ تو یہ بات ذرا لمبی ہے۔ اس میں مجھے عمر رفتہ کو آواز دینی پڑے گی۔ مکہ میں مشرکین نے حضرت خبیبؓ انصاری کو گرفتار کر لیا اور ان کی بوٹیاں اڑا کر انہیں کھجور کے تنے کے ساتھ لٹکا دیا۔ اور پوچھا کہ کیا تو پسند کرتا ہے کہ اس وقت تیری جگہ محمدؐ ہوتا؟

انہوں نے جواب دیا کہ ملعونو! تم یہ کیا کہتے ہو۔ میں تو اسے بھی پسند نہیں کر سکتا کہ میں آرام سے رہوں اور حضورؐ کے پاؤں میں کانٹا بھی چُبھ جائے۔ اس پہ قریش نے انہیں سخت اذیت دے کر صلیب دی۔

جب کبھی مجھے وہ دن یاد آ جاتا ہے تو کانپ اٹھتا ہوں کہ خدا میرا یہ گناہ کبھی نہیں بخشے گا کہ میں نے اپنے سامنے یہ سب کچھ ہوتے دیکھا اور خبیبؓ کی کوئی مدد نہ کی۔ میں ان دنوں مشرک تھا۔ خدا پہ ایمان نہیں رکھتا تھا۔ بایں ہمہ میں سمجھتا ہوں کہ مجھے ایک مظلوم کی مدد کرنی چاہیئے تھی۔ جب اپنے اس گناہ کا احساس غالب آ جاتا ہے تو مجھ پہ سکتہ طاری ہو جاتا ہے۔

یہ تھے اس دور کے گورنر۔ اور اس کے باوجود، سربراہ مملکت ان کی رفتار، گفتار، کردار پہ کڑی نگاہ رکھتا تھا۔ ہم یہ بھی دیکھ چکے ہیں کہ شکایتوں کی تحقیق وتفتیش سرعام (پبلک کے سامنے) ہوتی تھی، اور الزام

سرِعام سزا

صحیح ثابت ہونے پہ، سزا بھی پبلک میں دی جاتی تھی۔ حضرت عمرو بن عاصؓ نے ایک دفعہ اس طریق کار کے خلاف احتجاج بھی کیا تھا اور کہا تھا کہ اس طرح عمال حکومت بزدل ہو جائیں گے اور رعایا کی ان کے خلاف جرأتیں بڑھ جائیں گی۔ اس پہ آپ نے فرمایا تھا کہ جو عامل انصاف کا تقاضا پورا کرنے پہ بزدل ہوتا ہے۔ وہ منصب حکومت کے قابل ہی نہیں۔ باقی رہا سزا کا پبلک میں دیئے جانا تو یہ

قرآن کریم کے ارشاد کے عین مطابق ہے جہاں اس نے کہا ہے کہ سزا پبلک میں دی جائے اور اس باب میں ذرا سی بھی نرمی نہ برتی جائے۔ (۲۴/۲)

آپ عمالِ حکومت کے بارے میں اس قدر سختی کیوں برتتے تھے، اس کی وجہ بھی آپ نے بیان فرما دی تھی۔ ایک دفعہ آپ نے دیکھا کہ حضرت طلحہؓ طواف میں رنگا ہوا کپڑا پہنے تھے۔ آپ نے

ہمارا ہر عمل عوام کے لئے سند بن جاتا ہے

کہا کہ طلحہؓ! طواف میں رنگ دار کپڑا، چہ معنی دارد؟ انہوں نے کہا کہ یہ تو مٹی کا رنگ ہے۔ آپ نے فرمایا "طلحہؓ! دوسرے لوگوں کی نسبت آپ حضرات کو بہت زیادہ محتاط ہونے کی ضرورت ہے۔ آپ لوگوں کے امام ہیں جن کی اقتداء عوام کرتے ہیں۔ اگر کوئی جاہل آپ کو دیکھے گا تو وہ اپنے لوگوں سے کہے گا کہ میں نے حضرت طلحہؓ کو بحالت طواف رنگ دار کپڑا پہنے دیکھا تھا۔ یوں تمہارا یہ معصوم سا عمل لوگوں کے لئے سند بن جائے گا۔ لہٰذا ہم لوگوں کو بڑی احتیاط برتنی چاہیئے۔

اور یہی وجہ تھی کہ آپ ان ذمہ دار حضرات کا چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھی مؤاخذہ کرتے تھے۔

لیکن دوسروں کا محاسبہ اور مؤاخذہ کرنے سے پہلے، امیرالمومنین خود اپنا محاسبہ کرتے؛ اور اپنے آپ کو لوگوں کے سامنے مؤاخذہ کے لئے پیش کرتے تھے۔ واقعہ مشہور ہے کہ یمنی چادریں آئیں تو آپ نے سب کو ایک ایک چادر دے دی۔ ایک دن

خود اپنا محاسبہ

آپ منبر پر تشریف لائے اور حسب معمول مجمع سے کہا کہ ——— اسمعوا و اطیعوا "سنو جو کچھ میں کہتا ہوں اور پھر اس کی اطاعت کرو"

یمنی چادریں

مجمع میں سے آواز آئی ——— "ہم نہ تمہاری سنیں گے، نہ اطاعت کریں گے ..." کہنے والے حضرت سلمان فارسیؓ تھے۔ سربراہِ مملکت منبر سے نیچے اتر آئے اور کہا کہ ابو عبداللہ! کیا بات ہے؟"

کہا "عمرؓ! تم نے دنیا داری برتی ہے۔ تم نے ایک ایک چادر تقسیم کی تھی، اور خود دو چادریں پہن کر آئے ہو!"

فرمایا۔ عبداللہ بن عمرؓ کہاں ہے؟

حاضر ہوں! امیرالمومنین!

فرمایا۔ بتاؤ۔ ان میں سے ایک چادر کس کی ہے عرض کیا میری ہے۔ امیرالمومنین!

آپ نے حضرت سلمانؓ سے مخاطب ہو کر فرمایا۔ ابو عبداللہ! تم نے جلدی کی جو بات پوچھے بغیر احتجاج کر دیا۔ میں نے اپنے میلے کپڑے دھوئے تھے۔ باہر آنے کے لئے ایک چادر کافی نہیں تھی۔ اس لئے میں نے (اپنے بیٹے) عبداللہ سے چادر مانگ لی تھی۔

(حضرت) سلمانؓ نے کہا۔ ہاں! اب کہئے۔ یا امیرالمومنین! ہم سنیں گے بھی اور اطاعت بھی کریں گے

آپ خود اپنا یہ قول کیسے بھول سکتے تھے کہ

رعیت اس وقت تک امیر کی اطاعت کرتی ہے جب تک وہ خدا کی اطاعت کرتا رہے۔

ایک درہم

حضرت معیقیبؓ بیت المال کے خزانچی تھے۔ ایک دن بیت المال میں جھاڑو دے رہے تھے تو کوڑے میں سے ایک درہم (اس وقت کا کم از کم سکہ) ہاتھ لگا۔ اتفاق سے حضرت عمرؓ کے گھر کا ایک بچہ پاس کھڑا تھا۔ خزانچی نے وہ درہم اس بچے کو دے دیا اور گھر چلا گیا۔ ابھی گھر پہ پہنچا ہی تھا کہ امیر المومنین کا بلاوا آگیا۔ وہ آیا تو دیکھا کہ وہی درہم آپ کے ہاتھ میں تھا۔ کہا کہ معیقیبؓ! میں نے تمہارے ساتھ کون سی زیادتی کی تھی جو تم نے مجھ سے اس طرح بدلہ لینا چاہا۔ تم سوچو کہ قیامت کے دن جب امت محمدیہ مجھ سے اس درہم کی بابت پوچھے گی تو میں کیا جواب دوں گا۔

عمرؓ! خدا سے ڈر

ایک شخص نے آپ سے بھرے مجمع میں کہا کہ عمرؓ! خدا سے ڈر۔ وہ بار بار اس جملہ کو دہراتا چلا گیا۔ تو مجمع میں سے ایک شخص نے اس سے کہا کہ اب بس بھی کرو، تم بہت کہہ چکے۔ حضرت عمرؓ نے اسے روکا اور کہا کہ نہیں! اسے کہنے دو۔ اگر لوگ ایسی بات نہ کہیں تو سمجھ لو کہ ان میں خیر کا ذرہ تک نہیں رہا۔ اور اگر ہم اسے نہ سنیں تو سمجھ لو کہ ہم میں خیر کی رمق تک نہیں رہی۔

ایک دن آپ نے برسرِ منبر کہا کہ صاحبو! اگر میں دنیا کی طرف جھک جاؤں تو تم کیا کرو گے؟ ایک شخص کھڑا ہو گیا۔ تلوار نیام سے نکالی اور کہا کہ ہم تمہارا سر اڑا دیں گے۔ آپ نے اسے آزمانے کے لئے کہا کہ کیا تو میری شان میں یہ بات کہتا ہے؟ اس نے نہایت سکون سے کہا کہ ہاں! تمہاری شان میں۔

خلیفہ ٹھیک نہ چلے تو

آپ نے فرمایا کہ الحمدللہ! قوم میں ایسے لوگ موجود ہیں کہ اگر عمرؓ بھی کج رو ہو جائے تو وہ اس کا سر اڑا دیں۔

اور یہ "سر اڑا دینے کی بات" تو خود آپ ہی نے انہیں بتائی تھی۔ ایک دفعہ آپ نے کہا کہ اگر خلیفہ ٹھیک ٹھیک چلے تو لوگوں کو چاہیئے کہ اس کی اطاعت کریں۔ لیکن اگر وہ غلط راستہ اختیار کرے تو اسے قتل کر دینا چاہیئے۔

حضرت طلحہؓ پاس بیٹھے تھے۔ انہوں نے کہا کہ آپ نے یہ کیوں نہ کہا کہ اگر خلیفہ ٹھیک نہ چلے تو اسے معزول کر دینا چاہیئے۔ آپ نے فرمایا۔ "نہیں! قتل کر دینا بعد میں آنے والوں کے لئے زیادہ عبرت ناک ہوگا۔"

اس مقام پر اتنا سمجھ لینا ضروری ہے کہ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اسلامی نظام میں ہر شخص کو اس کا حق حاصل ہوتا ہے کہ اگر وہ اپنی دانست میں سمجھے کہ خلیفہ غلطی کر رہا ہے تو وہ اٹھ کر اس کا سر اڑا دے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ جن جرائم کی سزا موت ہے اگر وہ خلیفہ سے بھی سرزد ہوں تو اسے بھی وہی سزا دینی چاہیئے۔ اس باب میں سربراہِ مملکت اور عام لوگوں میں فرق نہیں کرنا چاہیئے۔

لیکن حضرت عمرؓ یہ بھی جانتے تھے کہ سربراہِ مملکت کا احتساب اس کی ذات تک محدود نہیں ہونا چاہیئے

اہل وعیال کا احتساب

اس میں اس کے اہل وعیال بھی برابر کے شریک ہونے چاہئیں۔ قرآن کریم نے جو بعض بیوی بچوں کو انسان کا دشمن (۱۴/۶۴) اور مال اور اولاد کو فتنہ (۱۵/۶۴) کہا ہے تو یہ خطرناک گھاٹی ان کی نگاہوں سے اوجھل نہیں تھی۔ چنانچہ آپ کا دستور تھا کہ جب لوگوں کو کسی بات سے منع کرتے تو اپنے گھر والوں کو جمع کر کے ان سے کہتے کہ میں نے لوگوں کو فلاں فلاں چیز سے منع کیا ہے۔ یاد رکھو: لوگ تمہاری طرف اس طرح دیکھ رہے ہیں جس طرح پرندہ گوشت کی طرف دیکھتا ہے۔ اگر تم بچو گے تو وہ بھی بچیں گے۔ اور اگر تم پھنسو گے تو وہ بھی پھنسیں گے۔ اگر تم میں سے کسی شخص نے ان باتوں کا ارتکاب کیا تو خدا کی قسم! میں اپنے ساتھ تمہارے تعلق کی وجہ سے تمہیں دگنی سزا دوں گا۔ اب تمہیں اختیار ہے، جو چاہے حدود سے تجاوز کرے، جو چاہے ان کے اندر رہے۔

اور یہ "دگنی سزا" کا فیصلہ قرآن کریم کے اس ارشاد کے مطابق تھا جس میں نبی اکرمؐ کی ازواج مطہراتؓ سے کہا گیا تھا کہ یاد رکھو! تم عام عورتوں کی طرح نہیں ہو۔ تم میں سے جو کسی جرم کی مرتکب ہوگی اُسے دُگنی سزا ملے گی (۳۰/۳۳)۔ حضرت عمرؓ نے اپنے ارشادِ گرامی سے اس نکتہ کی وضاحت کر دی کہ قرآن کا وہ حکم مملکت اسلامیہ کے ہر سربراہ پر یکساں عاید ہوتا ہے۔

یہ تھا مملکت کی ذمہ داریوں کا احساس جس کے پیشِ نظر آپ نے (جیسا کہ پہلے لکھا جا چکا ہے) مصر کے قاصد (حضرت معاویہ بن خدیجؓ) سے کہا تھا کہ تم نے خیال کیا کہ دوپہر کا وقت ہے۔ امیر المومنین

ذمہ دار کو نیند کہاں؟

اس وقت قیلولہ فرما رہے ہوں گے۔ معاویہؓ! جس کے ذمے مملکت کے فرائض ہوں، دن تو ایک طرف اسے رات کے وقت بھی نیند نہیں آ سکتی۔

ذمہ داریوں کا احساس

اسی ذمہ داری کا احساس تھا جس پر نگاہ رکھتے ہوئے حضرت عباسؓ نے اس شخص کے سوال پر کہ حضرت عمرؓ کیسے تھے۔ جواب میں کہا تھا کہ:-

وہ اس خوف زدہ پرندہ کے مانند تھے جیسے ہر طرف جال ہی جال نظر آ رہے ہوں۔

حضرت انسؓ کی روایت ہے کہ ایک سفر میں، میں حضرت عمرؓ کے ساتھ تھا۔ وہ راستہ میں ایک احاطہ کے اندر داخل ہو گئے۔ میں نے پس دیوار کان لگا کر سنا تو آپ کہہ رہے تھے :-

خطاب کا بیٹا عمر اور امیر المومنینؓ، اللہ اکبر! خطاب کے بچو کرے، اللہ سے ڈرتا رہ۔ ورنہ وہ تجھے ہلاک کر دے گا۔

ایک دن آپ نے اعلان کیا کہ "الصلوٰۃ جامعہ" لوگوں نے حسبِ معمول سمجھا کہ کوئی اہم معاملہ درپیش ہے جس کے لئے اجتماعی اعلان ہوا ہے۔ وہ جمع ہوئے تو آپ منبر پر تشریف لے گئے اور فرمایا :-

لوگو! میں اپنی مخزومی خالاؤں کے اونٹ چرایا کرتا تھا اور ان کا پانی بھرا کرتا تھا جس کے عوض وہ مجھے مٹھی بھر چھوہارے دے دیا کرتی تھیں۔

یہ کہہ کر آپ منبر سے اتر آئے۔ حضرت عبدالرحمٰن بن عوفؓ نے کہا کہ امیرالمومنین! ہم سمجھے نہیں کہ اس اجتماع اور اعلان کا مطلب کیا تھا؟ فرمایا۔ آج میں تنہا بیٹھا تھا کہ دل نے کہا کہ تو امیرالمومنین ہے۔ تیرے اور اللہ کے درمیان کوئی قوت نہیں۔ تجھ سے افضل کون ہو سکتا ہے۔ اس پر میں کانپ اٹھا اور کہا کہ ضروری ہو گیا ہے کہ میں اپنے نفس کو بتا دوں کہ وہ ہے کیا؟ اس اجتماع اور خطاب سے یہی مقصد تھا۔

ایک دن حضرت عمرؓ، حضرت علیؓ اور حضرت عثمانؓ بیت المال کے اونٹوں کا جائزہ لینے کے لئے گئے۔ حضرت عمرؓ اونٹوں کو دیکھ دیکھ کر ان کے احوال و کوائف بولتے جاتے تھے۔ حضرت علیؓ سن سن کر حضرت عثمانؓ کو املا کراتے جاتے تھے اور وہ انہیں، ایک درخت کے نیچے بیٹھے لکھتے جاتے تھے۔ حضرت عمرؓ دھوپ میں کھڑے تھے۔ دھوپ سخت تھی لیکن وہ کام میں ایسے منہمک تھے کہ انہیں اس کی شدت کا قطعاً احساس نہیں تھا۔ حضرت علیؓ نے حضرت عثمانؓ کو مخاطب کر کے کہا کہ آپ نے قرآن مجید میں حضرت شعیبؑ کی بیٹیؓ کا یہ قول پڑھا ہو گا جس نے کہا تھا کہ یٰۤاَبَتِ اسْتَاْجِرْهُ ۖ اِنَّ خَيْرَ مَنِ اسْتَاْجَرْتَ الْقَوِيُّ الْاَمِيْنُ (۲۸/۲۶) "ابا جان! اسے (حضرت موسیٰؑ کو) ملازم رکھ لیجئے کیونکہ بہترین خدمت گزار وہ ہے جو قوی بھی ہو اور امین بھی"! حضرت علیؓ نے حضرت عمرؓ کی طرف اشارہ کر کے کہا۔ یہ ہے قوی الامین۔

اَلْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ

اَلْقَوِیُّ الْاَمِیْنُ۔ ان دو لفظوں میں حضرت عمرؓ کی ساری شخصیت سمٹ کر آجاتی ہے۔

اس دور کے عمال حکومت جو اس قدر امین تھے تو اس کا راز بھی اسی میں تھا کہ سربراہ مملکت خود امین تھا۔ آپ کو یاد ہو گا کہ مدائن کی فتح کے بعد حضرت سعد بن ابی وقاصؓ نے مال غنیمت مدینہ بھیجا۔ تو زر و جواہرات کی اس قدر کثرت اور نوادرات کے ایسے تنوع کو دیکھ کر اہل مدینہ کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئی تھیں۔ حضرت سعدؓ نے اپنے خط میں لکھا تھا کہ امیرالمومنین! یہ مال و متاع اس قدر وجہ تعجب اور باعث مسرت نہیں جس قدر یہ امر کہ جب ہم نے یہ شہر فتح کئے ہیں تو یہ تمام زر و جواہرات آپ کی فوج کے سپاہیوں کے سامنے پڑے تھے اور کوئی باہر کا دیکھنے والا بھی نہیں تھا لیکن ان میں سے کسی نے ایک سوئی تک بھی اپنے پاس نہیں رکھی۔ سارے کا سارا مال لاکر مرکز میں ڈھیر کر دیا۔ یہ پڑھ کر حضرت عمرؓ کی آنکھوں میں خوشی کے آنسو بھر گئے۔ حضرت علیؓ پاس کھڑے تھے۔ فرمایا کہ :-

جیسا سربراہ ویسے عمّال

ابن خطاب! تمہارے سپاہی اس لئے امین ہیں کہ تم امین ہو۔

یہ تھا سارا راز اس دور کی حکومت کی درخشندگی اور تابندگی کا ——— اس دور میں سربراہ مملکت کا فریضہ، مملکت کے انتظام کی درستگی ہی نہیں تھا۔ اس کا فریضہ حکومت کے اعضاء و جوارح کی سیرت و کردار کی درستگی بھی تھا ——— بلکہ ہم تو یہ کہیں گے کہ اس کا اولین فریضہ ارکان حکومت کی سیرت و کردار کی درستگی تھا۔ انتظام کی درستگی، ان کی سیرت کی درستگی کا فطری نتیجہ تھا۔